Title - GHALIB KA ROZ NAAMCHA GHADAR - GHAD
DEHLI KE AFSANON KA SAATWAN HISSA.

Creator - Khwaja Hasan Nizami.

Publisher - Karkan Khwaja Dipo (Dehli).

Date - 1921

Pages - 80

Subjects - Atthara Sau Sattawan; Tareekh Hind - Auhad Mughaliya - Door Akhir; Ghalibiyaat - Roz Naam Ghadar.

ھوالکل

غدرِ دہلی کے افسانوں کا ساتواں حصّہ

غالب کا روزنامچہ غدر ۱۸۵۷ء

نہایت دردناک بالکل سچے اور خاص میرزا غالب مرحوم کے ہاتھ سے لکھے ہوئے مفصل حالات جو دہلی واہل دہلی کو غدر ۱۸۵۷ء میں پیش آئے اور جسکے آخر میں غالب کی مشہور و معروف تاریخ غدر

"دستنبو"

کا
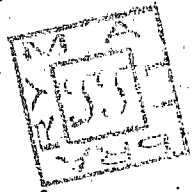
اُردو ترجمہ

بھی شامل ہے، اور جسکو پوری جستجو سے مصوّرِ فطرت حضرت مولانا خواجہ حسن نظامی دہلوی نے مرتب کیا

نومبر ۱۹۲۱ء میں کارکن خواجہ ڈپو دہلی نے

لالہ امرداس اینڈ سنز کے دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

بار اوّل (کتب خانہ قومی) قیمت بارہ آنے (۱۲) مجلد عہ

غالب کے خاص قدردان

جناب ڈاکٹر سیّد محمود صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی

بیرسٹر بانٹی پور کے نام اس کتاب کو منسوب کیا جاتا

ہے کیونکہ وہ غالب کے ہاتھ سے لکھے اور دماغ

سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کے عاشق ہیں

اور کلام غالب پر ایک لاجواب مقدمہ لکھ چکے ہیں

حجرۂ رین بسیرا

درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین

اولیاء محبوب الٰہی رض دہلی۔

حسن نظامی

یکم نومبر ۱۹۲۱ء

هو الکل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غالب کا روزنامچۂ غدر

۱۸۵۷ء

غدرِ دہلی کے افسانوں کا ساتو

دیباچہ غدر ۱۸۵۷ء کے حالات چھ حصوں میں شائع کر چکا ہوں ہر حصہ میں ایک مخصوص بات غدر کے متعلق ہے۔ پہلے حصہ میں وہ قصے ہیں جنکو میں نے بہادر شاہ کے خاندان کی عورتوں، بچوں اور مردوں کی آپ بیتی کیفیت کو ان سے سن کر یا دوسری جگہ سے معلوم کر کے اپنے طریقۂ بیان کے اضافہ سے قلمبند کیا۔ اور کئی بار یہ کتاب چھپی۔

دوسرے حصہ میں انگریزوں کی خود نوشت کیفیت ہے۔ یعنی غدر میں ان پر جو مصیبتیں پڑیں اُن کو انھوں نے لکھ لیا۔ اس کا نام انگریزوں کی بپتا ہے اور اس کے بھی کئی اڈیشن شائع ہوئے۔

تیسرے حصہ میں محاصرۂ دہلی کی وہ خط و کتابت ہے جو انگریزی فوج کے انگریز افسروں نے محاصرۂ دہلی کے مقام پر پنجاب کے انگریز افسروں سے کی۔

چوتھے حصہ میں بہادر شاہ بادشاہ کے مقدمہ کی مفصل روئداد ہے۔

پانچویں میں وہ خفیہ خطوط ہیں جو غدر کے زمانہ میں بادشاہ نے لوگوں کو لکھے۔

چھٹے میں اخبارات کے وہ مضامین ہیں جو زمانۂ غدر میں شائع ہوئے اور جن کو اسبابِ غدر میں ایک سبب قرار دیا گیا تھا۔

اب یہ ساتواں حصّہ میرے خیال میں سب حصّوں سے زیادہ دلچسپ، مؤثر اور دردناک سمجھا جائیگا۔ گو آجکل پہلے حصّہ کو جو میرا لکھا ہوا ہے بہت پسند کیا جاتا ہے مگر حق یہ ہے کہ جب غالب کا یہ روزنامچہ شائع ہوگا تو میرا لکھا ہوا پہلا حصّہ اس کے سامنے ماند ہو جائیگا۔ کیونکہ میرے لکھے ہوئے حصّہ میں قصّہ کا مبالغہ ہے۔ اور بہت سی باتیں درد کا اثر بڑھانے کو محض فرضی لکھی گئی ہیں۔ میں نے یہ مضامین جو پہلے حصّہ میں جمع کرکے شائع کیے گئے ہیں تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ ہندوستانیوں کو عبرت دلانے اور دنیا کا انجام اور نتیجہ دکھانے کے لیے مختلف موقعوں پر لکھے اور مختلف رسائل و اخبارات میں شائع کرائے تھے۔ اس لیے ان میں کسی قسم کی تاریخی اہمیت نہیں ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے ان کا نام "افسانے" رکھا ہے تاکہ ان کو تاریخی واقعات نہ سمجھ لیا جائے۔

غالب کے روزنامچہ میں ایک حرف بھی فرضی نہیں ہے۔ بلکہ چشم دید اصلی حالات کی تصاویر ہیں۔ اور پھر بیان ایسا صاف، ستھرا اور اعلیٰ ہے کہ میری عبارت اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔

غالب کے اس روزنامچہ سے دہلی کی عمارتوں، دہلی کے نامور آدمیوں، دہلی کی قدیمی معاشرت، دہلی کے پرانے احساسات کا اتنا بڑا تاریخی ذخیرہ حاصل ہوتا ہے جو کسی غدریہ دہلی کی تاریخ میں نہیں ملے گا۔

ایک بات نہایت ہی اہم اس روزنامچہ سے ظاہر ہوگی اور وہ یہ ہے کہ

غدر کی تاریخ لکھنے والے عموماً یا تو انگریز تھے اور یا انگریزوں کے زیرِ اثر مورخ اِس واسطے اُس میں واقعات کا ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے۔ مگر غالب کے روزنامچہ سے تصویر کا دوسرا اور بہت ہی پوشیدہ رُخ بھی ظاہر ہو جائیگا اور مورخوں کو اِس سے بہت مدد ملے گی۔

یہ روزنامچہ کہاں سے آیا

لوگوں کو حیرت ہو گی کہ غالب کا یہ روزنامچہ کہاں سے آ گیا۔ پہلے تو کبھی اِس کا ذکر بھی نہیں سُنا تھا۔ اس واسطے میں اس حقیقت کو بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غالب نے غدر کا کوئی خاص روزنامچہ نہیں لکھا تھا۔ نہ غالباً ان کو روزنامچہ لکھنے کی عادت تھی میں نے یہ روزنامچہ خود تصنیف کیا ہے۔ اور لُطف یہ ہے کہ اس تصنیف میں ایک حرف بھی میرا نہیں ہے اور سب غالب کے قلم سے نکلا ہوا ہے۔

اس معمّہ اور چیستان کا حل یہ ہے کہ غالب کے خطوط میں جہاں جہاں غدر کا ذکر ضمناً آیا تھا میں نے پوری تلاش و محنت سے اس کو الگ کر لیا۔ اور ایسے طریقہ سے چھانٹا کہ روزنامچہ کی عبارت معلوم ہونے لگی۔ بس میرا کمال اسی قدر ہے کہ میں نے بغیر بیشی الفاظ کے خطوط کو روزنامچہ بنا دیا اور کوئی شخص اس کو پڑھ کر خطوط کا شبہ نہیں کر سکتا۔

غالب کے مکتوبات مطبوعہ و غیر مطبوعہ میں غدر کی کیفیت ایسی دبی ہوئی پڑی تھی کہ کوئی شخص اس کی خوبی و اہمیّت کو محسوس نہ کر سکتا تھا اور خطوں کے ذیل میں ان عبارتوں کو بھی بے توجہی سے پڑھ لیا جاتا تھا۔

میں نے اِس ضرورت کو محسوس کیا کہ اُردو زبان میں غدر دہلی کی لا ثانی تاریخ

جو موتیوں سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے اس طرح دبی ہوئی نہ پڑی رہے۔ اسلیے اس کو علیحدہ کرنا شروع کیا۔ اور کہیں کہیں اپنے حاشیے بھی لکھے تاکہ آجکل کے لوگوں کو دہلی کی بعض مقامی باتوں سے واقفیت ہو جائے اور جس چیز کا مطلب سمجھ میں نہ آئے حاشیہ کی مدد سے سمجھ لیں۔

کوشش کے باوجود غالب کی تحریروں میں بعض باتیں ایسی ہیں جنکا حل میں بھی نہ کرسکا۔ دوسرے ایڈیشن کے موقع پر مزید تحقیق کی توفیق خدا تعالے نے دی تو اس کمی کو پورا کردیا جائیگا۔

ایک نہایت مشکل کام

روزنامچہ کی تیاری میں یہ پیش آیا کہ بعض مکتوبات پر غالب نے تاریخ اور سنہ لکھے ہیں اور بعض پر صرف تاریخ اور دن ہے مگر سنہ نہیں لکھا۔ اور بعض پر نہ سنہ ہے نہ تاریخ ہے۔ اس واسطے ترتیب کا فرض ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ پہلی عبارت کون سی ہے اور دوسری کون سی۔ ناظرین خود اپنی سمجھ سے اس مشکل کو حل کرسکتے ہیں۔

دوسری مشکل

اس روزنامچہ میں یہ ہے کہ بعض مضامین اور واقعات مکرر یعنی کئی کئی بار لکھے گئے ہیں خصوصاً پنشن کے حالات بہت جگہ آئے ہیں۔ ان کو میں نے اسلیے قائم رکھا اور کم نہیں کیا کہ گو واقعہ ایک ہی ہے مگر طرز ادا میں ہر جگہ نئی قسم کی خوبی ہے اور غالب نے اپنے ہر مخاطب کو ایسے لطف سے کیفیت لکھی ہے کہ نیا مضمون بنا دیا ہے۔ اور پھر کمال یہ ہے کہ واقعات میں کمی بیشی نہیں ہونے دی جس سے غالب کی صدق بیانی پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

حسن نظامی

شعبان ۱۳۴۳ھ

۷۸۶

غالب کا روزنامچہ غدر ۱۸۵۷ء

غالب کا نسب نامہ

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اسکے جو طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصیر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا اس نے مجھے پالا۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا برگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر تعین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی کہ بمرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ سنہ ۱۸۳ء میں کلکتہ گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا میری ریاست

کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ۔ سرپیچ۔ مالائے مروارید
یہ تین رقم کا خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلّی میں دربار ہوا مجھکو بھی خلعت ملتا رہا
بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہوگئے۔ میری بریت
کی درخواست گزری۔ تحقیقات ہوتی رہی تین برس بعد پنڈ چھوٹا۔ اب خلعت
معمولی ملا۔

یہ خلاصہ ہے غالب کے نسب نامہ اور زندگی کے بڑے بڑے واقعات
کا اتنے اختصار سے اتنی بڑی لائف کا ماحصل لکھ دینا۔ معمولی بات نہیں ہے،
یہ قدرت خدا نے غالب کے قلم کو دی تھی۔

ترک اہل سیف ہوتے ہیں اہل قلم نہیں ہوتے

برٹش گورنمنٹ کے موجودہ متعصب اور
عاقبت کے اندیشہ سے بے بہرہ وزیر اعظم
مسٹر لائڈ جارج نے خلافت ڈپوٹیشن ہندوستان کے ارکین سے کہا تھا کہ
ترکوں کو تلوار نچانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔ ان میں کوئی قلمی بہادر پیدا نہیں
ہوا اس کے جواب میں غالب و خسرو کو پیش کیا جا سکتا ہے جو دونوں دہلی
درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؓ میں دفن ہیں کہ امیر خسرو بھی ترک
لاچین تھے۔ اور غالب بھی ترک سلجوقی تھے جیسا کہ اس عبارت میں انھوں نے
خود لکھا ہے۔ اب غالب و خسرو کے کمالات علمی و شعری اور فضائل فلسفہ
و ادراک حس انسانی کو دیکھنا چاہیے۔ ان کی لاجواب تصنیفات کو پڑھنا چاہیے
انگلش قوم کے علماء و فلاسفرز میں جو بات افرادی تھی وہ ان میں مجموعی تھی۔
یعنی انگریزوں میں ایک خاص فن کا کوئی ماہر ہوتا تھا اور اس فن کے سبب

اس کی عزت ہوتی۔ اور غالب وخسرو مجموعۂ کمالات تھے کہ متعدد وفضائل انکے اندر تھے۔

تو کیا ہندوستان کے یہ دو مشہور ترک ہندوستانی وفد خلافت کی طرف سے لارڈ جارج کو یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ترک صاحب سیف تھے ہیں اور صاحب قلم بھی۔ تم کو واقفیت حاصل کیے بغیر زبان سے اتنی بڑی بات کہدینی مناسب نہ تھی کہ تم ساری برطانی قوم کے قائم مقام ہو۔

غالب کا حلیہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی۔ اور ڈاڑھی بھی تاکہ اس بھونڈے شہر (دہلی) میں ایک وردی ہے عام۔ مُلّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جولاہہ، کُنجڑا۔ مُنھ پر ڈاڑھی سر پہ بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر مُنڈایا۔

اِس سے معلوم ہوا جوانی میں بہت طرحدار جوان تھے۔ ڈاڑھی مُنڈاتے تھے اور اس وقت کے دستور کے موافق دانتوں پر مسی بھی ملتے تھے۔

غالب کی ازلی طبیعت | علم و ہنر سے عاری ہوں۔ لیکن پچپن برس سے مجو سخن گزاری ہوں۔ مبدءِ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد تربیت اُستاد حُسن و قبح ترکیب پہچاننے، فارسی کے غوامض جاننے لگا۔

غالب کا مجموعہ کلام | میرا کلام کیا نظم کیا نثر۔ کیا اُردو کیا فارسی۔ کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لیکر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان کے لاکھوں روپئے کے گھر لٹ گئے۔ جن میں ہزاروں روپئے کے کتب خانے بھی گئے۔ اُسی میں وہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے۔

غدر کی نسبت غالب کی تصنیف | میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور اس کا التزام کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے۔ وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔
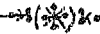
یہ کتاب دستنبو کا ذکر ہے۔ آگے بھی جگہ جگہ اس کی کیفیت مذکور ہوئی ہے اور غالباً اسی کتاب کو دیکھنے کے بعد انگریزی حکام اعلےٰ کو غالب کی قدر ہوئی اور شروع کی بیزاری، نفرت اور حقارت اور شبہ جاتا رہا جسکا

ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ کیونکہ دستنبو دیکھنے سے پہلے گورنر اور دیگر حکام انگریزی غالب کو معمولی شاعر اور بھاٹ خیال کرتے ہونگے اور بہادر شاہ کا سکہ کہنے کے سبب اور قلعہ میں جاتے آنے کی وجہ سے ان پر پوراشبہ باغیانِ غدر سے میل جول کا ہوگا۔ مگر جب کتاب دستنبو پڑھی گئی ہوگی اور اس سے غالب کی قابلیت اور غدر سے بے تعلقی ظاہر ہوئی ہوگی تب گورنر اور حکامِ انگریزی نے پنشن جاری کی ہوگی۔

غالب چشتی نظامی تھے شیعہ نہ تھے میاں نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب کی۔ وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے۔ اور میں مُرید ہوں اس خاندان کا۔

غالب کی نسبت شہرت ہے کہ وہ اثنا عشری شیعہ تھے۔ اور مکتوبات میں انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں۔ مگر یہاں وہ لکھتے ہیں کہ میں مولوی فخر الدین صاحب کے خاندان کا مُرید ہوں۔ جو چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے۔ درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین صاحب رح میں ان کا مزار ہے اور وہ فرزند تھے حضرت مولانا نظام الدین رح اورنگ آبادی کے اور غالب کے اکثر احباب اور امارو کا خاندان بھی حضرت مولینا فخر صاحب رح مذکور کے سلسلہ میں مرید تھا۔ میاں کالے صاحب انہی مولانا فخر صاحب کے پوتے تھے۔ جو بہادر شاہ کے پیر سمجھے جاتے تھے اور اسی

وجہ سے ان کی املاک وجائیداد کی ضبطی ہوئی جیسا کہ غالب نے اسی روزنامچہ میں لکھا ہے۔

پس اگر غالب چشتی نظامی سلسلہ میں مُرید تھے تو شیعہ کیونکر ہو سکتے تھے کیونکہ شیعہ مُرید نہیں ہوا کرتے۔ مگر انہوں نے خود لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں اس مشکل کا حل یہ ہے کہ چشتی نظامی فقرا اور ان کے مریدین محبت اہلبیتؑ میں بہت غلو رکھتے ہیں۔ اور بارہ اماموں سے بھی تعلق خاص رکھتے ہیں اس بنا پر غالب نے اپنے آپ کو اثنا عشری یعنی بارہ ائمہ کا ماننے والا لکھا ورنہ وہ شیعہ نہ تھے۔ شیعہ ہوتے تو مرنے کے بعد علی گنج شاہ مرداں کے قبرستان میں دفن ہوتے جو صفدر جنگ کے قریب ہے اور جہاں اس وقت کے تمام شیعہ اُمرا دفن ہوا کرتے تھے۔ اور اب بھی ہوتے ہیں۔ سُنّیوں خصوصاً چشتیوں نظامیوں کے قبرستان میں دفن ہونا اور درگاہ حضرت سلطانجی صاحب میں جو نظامیہ سلسلہ کے بانی ہیں ان کی میت کا لایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ سُنّی تھے شیعہ نہ تھے۔ ان کی قبر بھی سُنّی طریقہ کی بنائی گئی ہے۔ یعنی اس پر اونچا اونٹ کے کوہان کی صورت کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے۔ شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں۔ اُبھرا ہوا یا اونٹ کے کوہان کی شکل کا تعویذ ان کے ہاں نہیں بنایا جاتا۔

غالب کی قبر پر تاریخ میر مجروح کی کہی ہوئی کندہ ہے۔ جو غالب کے شاگرد اور شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ وہ تاریخ یہ ہے:۔

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں ۔۔۔ تھا تربتِ اُستاد پہ بیٹھا ہوا غمناک

دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہِ خاک

۱۲۷۵

تباہی قلعہ کی پیشین گوئی مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزلخوانی کر لیتے ہیں۔ میں کبھی اُس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے ابکے نہ ہو اور ابکے ہو تو آئندہ نہ ہو۔

یہ تحریر غدر سے پہلے کی ہے۔ لال قلعہ اور اس کے باشندوں کی نسبت جس انداز سے لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادوں کے اطوار اور ملک کی سیاست کے رُخ کو دیکھکر غالب نے سمجھ لیا تھا کہ اب یہ رونق چندروز کی مہمان ہے گو غدر کی خبر غالب کو نہ تھی کہ غیب کا علم نہ جانتے تھے پھر بھی آثار و قرائن سے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ انگریز اب اس بادشاہی کھلونہ کو سامنے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں جبھی تو انہوں نے صاف صاف لکھدیا کہ "یہ صحبت چند روزہ ہے۔ اِس کو دوام کہاں؟" اور یہ لکھکر تو اُنہوں نے پیش گوئی کا کمال ظاہر کر دیا کہ "کیا معلوم اب کے نہ ہو۔ اور اب کے ہو تو آئندہ نہو" گویا غالب کو قلعہ کی تباہی کا "نا یقین تھا کہ ایک دو سال کی قید بھی انہوں نے لگا دی۔

اب دہلی میں کون رہتا ہے؟ کہتے ہیں دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں

بہت ہوں گے۔ مگر اب یہ وہ دلی نہیں ہے بلکہ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام
کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ
پانچ پانچ روپئے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں۔ وہ کٹنیاں۔
اور جوانیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے
باپ کا بیٹا سو روپئے کا پنشن دار، سو روپئے مہینے کا روزینہ دار بنکر نامراد بن گیا
میر ناصر الدین۔ باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ
مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار
پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ ناظر حسین مرزا جن کا بڑا بھائی مقتولوں میں
آ گیا ہے۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو
مل گیا ہے۔ مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک
بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرتپور چلے گئے۔ ضیاء الدین کی پانسو روپے
کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ خراب پھر لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا
ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلب گڈھ، اور
فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپیہ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک
میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال ہے وہ بیان واقع ہے۔

جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اب دہلی میں نہ صاحب اخلاق و
مروت ہیں، نہ علم و ہنر والے ہیں، نہ اُمرا ہیں، نہ شعرا ہیں۔ نہ پہلے
سے علما و فقرا نظر آتے ہیں۔ اُن کو غالب کی یہ تحریر پڑھنی چاہیے کہ غدر نے

ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایسا تباہ کیا کہ آج تک اس شہر میں وہ پہلی سی بات پیدا نہ ہو سکی۔

اب دہلی میں دہلی والے کہاں ہیں؟ پردیسی لوگ آباد ہیں۔ دہلی والے یا تو پھانسیوں پر لٹک گئے یا جلا وطن ہو گئے۔ پھر اس غریب شہر کو بدنام کرنا اور اس کو قدیمی ناموری اور شہرت کی نظر سے دیکھنا بے عقلی نہیں تو کیا ہے؟

غالب نے یہ تحریر ایسے درد سے لکھی ہے کہ دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ غم کا نقشہ مجسم ہو کر آنکھوں کے راستہ دل میں گھسا چلا آتا ہے۔

ہندوستان غدر کے بعد

ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور زندگی نہیں۔

اب دہلی میں ساہوکاروں کے سوا کوئی امیر نہیں ہے

مسلمان امیروں میں تین آدمی۔ نواب حسن علی خاں۔ نواب حامد علی خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں، سو ان کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہذا یہاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں۔ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔

غدر کے بعد غالب نے دہلی کے مسلمان امرا کی تباہی کا جو جگہ جگہ نقشہ دکھایا

ہے وہ آج تک اصلی خط وخال میں موجود ہے کہ خاندانی مسلمان امیر ایک نہیں۔ ساہوکار امیر ہزار ہیں۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ تجارت کا تموّل نظر آتا ہے۔ حکومت کی موروثی امیری خواب وخیال ہوگئی۔

نواب فرّخ میرزا کا بچپن پرسوں فرخ میرزا آیا اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ پوچھا کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں۔ اور تم میرے کون ہو۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا حضرت آپ میرے دادا اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی؟ کہا جناب عالی آ کا جان کی تنخواہ آگئی ہے۔ میری نہیں آئی میں نے کہا لوہارو جائیے تو تنخواہ پائیے۔ کہا حضرت میں تو آ کا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو اپنی حکومت چھوڑ کر دلّی کی رعیت میں کیوں مل گئے۔ سبحان اللہ بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم۔ میں اسکی خوبی خو اور فرخی سیرت پر نظر کرکے اسکو فرّخ سیر کہتا ہوں۔

یہ نواب فرخ مرزا والی لوہارو کا ذکر ہے جن کو برٹش گورنمنٹ سے سر کا خطاب ہے اور توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ اور اعلےٰ درجہ کے والیان ریاست کے برابر اعزاز کیا جاتا ہے۔ درمیانہ قد ہے۔ گورا رنگ کٹوراسی آنکھیں۔ بڑی اور چڑھی ہوئی ڈاڑھی۔ بال سفید ہوگئے ہیں۔ نہایت خلیق وملنسار رئیس ہیں۔ اُردو ایسی بولتے ہیں کہ آدمی بیٹھا حیرت سے مُنھ دیکھا کرے۔ مولانا شبلی حسرت سے کہا کرتے تھے کہ فرصت ہو تو

فرخ میرزا کی باتیں سُننے کہ اصل اُردو ان کی باتوں میں ہے۔

غالب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، فرخ میرزا بچپن سے ہونہار تھے۔ ایک فقرہ تو اِس غضب کا غالب سے کہا کہ آجکل لوگ سُنیں تو متعجب ہوں۔ کیونکہ جنگِ یورُپ کے زمانہ میں جب نواب فرخ میرزا بصرہ گئے تو عوام نے مشہور کیا کہ وہ انگریزوں کی مدد کرنے گئے ہیں اور انہوں نے اسلامی حکومت کے درد کی پروا نہ کی۔ غالب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ میرزا طفلی سے ذاتی اور اسلامی حکومت کی خوبی کو محسوس کرتے تھے جب ہی تو اُنہوں نے کہا "اپنی حکومت چھوڑ کر دلّی کی رعیّت میں کیوں مل گئے۔"

مگر آفرین ہے فرخ میرزا کی بلاغت پر اس وقت بھی پہلو بچا کر بات مُنھ سے نکالی۔ دلّی کی رعیّت کہا انگریزی رعیّت نہ کہا۔
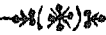
اینٹ سے اینٹ بجادی کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو اوّل روز پہلے بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ تمام کُرۂ شہر زمہریر ہوگیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچہ کا بقیّہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹڑہ کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہوگئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور پلیتن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جابجا ڈھاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو جو گلدستے ہیں جس کو عوام گمزی کہتے ہیں۔ انہیں

سے ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنا ڈھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ واہ رے بندر یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔ ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیال عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلّی میں وارد ہوا ہے بلیماروں کے محلّہ میں ٹھیرا ہے۔ بحسبِ ضرورت حکام شہر سے مل لیا ہے۔ باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و پگاہ غالب علی شاہ کے تکیہ پر آجاتا ہے۔

گورنمنٹ کو ملاقات کبھی منظور نہیں غدر کے رفع ہونے اور دلّی کے فتح ہونے کے بعد میرا پنشن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بدستور بے کم و کاست جاری ہوا۔ مگر لارڈ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی و مقرری تھا مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرٹری بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیر متکبر مایوسِ دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا۔ اور حکام شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا۔ بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانہ میں نواب لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلّی آئے۔ دربار کیا۔ خیر کرو مجھ کو کیا ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا۔ اور کہا کہ نواب لفٹننٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ سوار ہو گیا پہلے صاحب سکرٹر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصوّر میں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی یعنی عنایت سے عنایت۔ اخلاق سے اخلاق۔ وقتِ رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھکو اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں۔ اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالہ دربار میں شریک ہو خلعت پہن

باوجود اسکے کہ حکام گورنمنٹ نے کہدیا تھا کہ ملاقات کبھی منظور نہیں
پھر بھی غالب کے استقلال اور لگاتار جد وجہد نے اس کبھی نہیں کے قلعہ
کو فتح کرلیا اور ملاقاتیں ہونے لگیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انگریزی آئین میں قطعی فیصلے۔ طے شدہ
امر اور کبھی نہیں بھی بدل جاتے ہیں۔ اگر سانس والا مسلسل جد وجہد
کرتا رہے۔

مسٹر مارلے نے کہا تھا۔ تقسیم بنگال طے شدہ امر ہے۔ اس کی
منسوخی محال ہے۔ مگر بنگالیوں کی کوشش نے اس کو منسوخ کرا کے
چھوڑا۔

غالب کی چند کتب

پنج آہنگ کے دو چھاپے ہیں ایک بادشاہی چھاپہ خانہ کا
اور ایک منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ کا۔ پہلا ناقص ہے۔ دوسرا سراسر غلط ہے۔
ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو میرے بھتیجے بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں
جو نظم و نثر میں نے کچھ لکھا وہ اُنہوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی
چون چھپ چکی ہو۔ اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب ملکر سوا سو
جزو قطعات اور رقعات اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو دو
سو روپئے کے صرف میں ہوئی ہیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب ایک جا فراہم
ہے۔ پھر ایک شاہزادہ نے اس مجموعہ نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام
اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹا۔ وہ دونوں جگہ کا کتب خانہ جوان یغما

ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے۔ کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔ جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے۔ اُردو کی نثر انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔ مگر اُردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کرونگا۔ اور اس عبارت میں معانی نازک کیونکر بھروں گا۔

باوجود اس کسر نفسی کے غالب کی اُردو میں وہ زور ہے کہ آج تک باوجود ترقی اُردو کے کوئی شخص ان کا ہمسر اُردو لکھنے میں پیدا نہیں ہوا۔

مقتولوں اور مہجوروں کی یاد غم مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کرکے۔ اہل شہر کو گنتا ہوں مظفر الدولہ۔ میر ناصر الدین مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا اس کا بیٹا۔ احمد مرزا۔ اُنیس برس کا بچہ۔ مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ اسکے دو بیٹے ارتضےٰ خاں اور مرتضےٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کی برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں۔ میر احمد حسین میکش اللہ اللہ۔ ان کو کہاں سے لاؤں۔ غم فراق حسین مرزا۔ میر مہدی۔ میر سرفراز حسین میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے مگر ان کے گھر بے چراغ۔ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کر سکتا ہے مگر میں علیؑ کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر

میں تیرہ و تار ہے۔

فقیر اور ہتھیار نہ آئے بھائی فضلو عرب سرائیں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے پھرتے ہیں۔ عرضیاں دیتے پھرتے ہیں۔ کوئی سنتا نہیں۔ آمد و رفت کا ٹکٹ موقوف ہو گیا فقیر اور ہتھیار جس پاس ہو وہ نہ آئے۔ اور باقی ہندو مسلمان عورت مرد۔ سوار پیادہ جو چاہے چلا جائے چلا آئے۔ مگر رات کو شہر میں رہنے نہ پائے۔ وہ شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی۔ اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ مرہٹ کر ایک جان نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی ہے۔ دلی والوں نے لکھنؤ کا خاکہ اُڑا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ لاکھوں مکان ڈھا دیے۔ اور صاف میدان کر دیا۔ میں جانتا ہوں ایسا نہ ہوگا۔

امنِ عام کے بعد بھی فقیر اور ہتھیار والے کا شہر کے داخلہ سے ممنوع ہونا ظاہر کرتا ہے کہ حکام انتظامی ضرورت سے ایسا کرنے پہ مجبور تھے کیونکہ بغاوت کے وقت اکثر باغیوں نے فقیروں کے لباس میں دورہ کر کے غدر کی آگ بھڑکائی تھی۔

امام باڑہ کا انہدام آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزاخانہ ہے ایک بنائے قدیم۔ رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔ یہاں دو سڑکیں دوڑتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھکر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارگ بھی شہر میں بنے گا۔ اور قلعہ

سے آگے جہاں لال ڈگی ہے۔ ایک میدان نکالا جائیگا۔ بیچ سے کی دُوکانیں بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے تک سوائے لال ڈگی اور دو چار رکنوں کے آثار عمارت باقی نہ رہے گی۔ آج جان نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں کیوں ہیں دلی کے ویرانہ سے خوش نہ ہوں جب اہلِ شہر ہی نہ رہے۔ شہر کو کیا چولھے میں ڈالوں۔

پشم نہیں اکھیڑ سکتا زبان زدِ خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے بازپرس نہیں مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ اسے کوئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ حوالات میں ہے دیکھیے کہ حکم اخیر کیا ہو۔ صرف تو ندے راسے کی مختار کاری پر قناعت کی گئی۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو رہیگا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپئے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی۔ اور ان کی دو بہنیں سو سو روپئے مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپئے مہینہ تم کو ملیگا۔ نہ ترحم یہ ہے تو انتقام کیا قہر ہوگا۔ میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ۵۲ برس کا پنشن۔ تقرر اس کا بتجویز لارڈ لیک و بمنظوری گورنمنٹ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملیگا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔

پشم کا لفظ آجکل بےتہذیبی میں سمجھا جاتا ہے مگر اس زمانہ میں سب لکھتے اور

بولتے تھے۔ غالب نے لکھا تو دستور عام کے سبب لکھا۔ ورنہ ان کی عادت فحش نویسی کی نہ تھی۔

سب کچھ تم

اب تو فکر یہ پڑی ہوئی ہے کہ رہیے کہاں؟ اور کھائیے کیا؟ مولانا کا حال معلوم ہوا۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا سو ہولیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے۔ ورنہ خیر کچھ محل خوف و خطر نہیں ہے۔ حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں۔ اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے۔ اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔

ایک لطیفہ پرسوں خوب ہوا۔ حافظ ممّوں بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف تو ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر ہے۔ پرسوں وہ حاضر ہیں۔ مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا کہ حافظ محمد بخش کون ہے؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممّوں کون؟ عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممّوں ممّوں مشہور ہوں۔ فرمایا کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ اور حافظ ممّوں بھی تم۔ سارا جہان بھی تم جو

دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مثل داخلِ دفتر ہوئی۔ میاں ممّوں اپنے گھر چلے آئے۔

بات معمولی تھی حاکم کو اس کا جھنا د شوار نہ تھا کہ حافظ محمد بخش نام تھا اور لوگ ممّوں ممّوں کہتے تھے۔ پھر جو جائداد نہ دی گئی تو غالباً کوئی اور وجہ ہوگی۔ ورنہ اتنی سی بات پر حقدار کو اس کے حق سے محروم کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

احکامِ قضا و قدر سُنا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصانِ رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ اور حکم یہ ہے کہ جو رعیّت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ یک سرکار سے ہوگا۔ یعنی ہزار روپئے کے مانگنے والے[1] کو سَو روپئے ملیں گے۔ اور جو گوروں کے وقت کی غارتگری ہے وہ مدر اور مجل ہے۔ اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔ شاید یہ وہی کمشنر ہوں۔ مکانات حامد علی خاں تو مدّت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گئے۔ باغ کی صورت بدل گئی مجلسرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سر تا سر دُکانیں گرادی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخلِ خزانہ ہوا۔ جب بادشاہِ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیّت کی املاک کون پوچھتا ہے۔ جو احکام کہ دلّی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکامِ قضا و قدر ہیں ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ گویا ہم نہ کبھی کہیں کے رئیس تھے۔

---

[1] اسکے معنی معاف اور ناقابلِ گرفت کے ہیں۔ ۱۲

نہ جاہ وحشم رکھتے تھے۔ نہ املاک رکھتے تھے۔

دہلی کی چُنگی کے پہلے مُلازم

آجکل یہاں پنجاب احاطہ کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ رنومبر سے جاری ہو گئی سالگ رام خزانچی۔ چھنا مل مہیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطریق اہا (؟) سپرد ہوا ہے۔ غلّہ اور اُپلے کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے خلق کا اژدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں۔ حُکّام بے پروا۔ مختار کار۔ عدیم الفرصت۔ میں پاشکستہ۔ محمد قلی خاں کبھی یہاں۔ کبھی وہاں۔ وقت پر موقوف ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات شہران کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ دروازہ سے باہر نہ نکلو۔ اپنے گھر میں بیٹھے رہو نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض پر کرایہ کی مکانات میں مع ممتوعہ کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں مرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ انہوں نے زمین پکڑی ہے۔ سلطان جی میں رہتے ہیں عُذر کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ جبر اُٹھ جائے یا یہ خود اُٹھ جائیں۔

لالہ سالگرام و چھنا مل صاحب اور مہیش داس صاحب جن کا ذکر پون ٹوٹی کی ابتدائی خدمت میں آیا بعد میں بہت نامور ہوئے۔ مہیش داس کے نام سے ایک محلہ آباد ہے۔ لالہ سالگرام و چھنا مل کی اولاد تیل کے کٹرہ میں بڑے کرّ و فر سے رہتی ہے اور دہلی کے اعظم رئیسوں میں اس کا شمار رہے۔ اسکے افراد کی گورنمنٹ

میں بڑی عزت ہے۔ خطابات ہیں۔ لاکھوں روپے سال کی آمدنی ہے بہت
صاف ستھرے، گورے چٹے اور قدامت کی شان کے یہ لوگ ہیں +

تصوف اور نجوم

آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے۔ ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے۔ بہرحال علم نجوم کے قاعدہ کے موافق جب زمانہ کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں جس برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہان آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا۔ اور ان دنوں میں آفتاب اول میزان میں تھا۔ تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارہ کی دھوم رہی۔ اب وہ دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں۔ اور دلیلیں ملک کی تباہی کی۔ قرانِ نحسین پھر کسوف پھر خسوف پھر یہ صورت پر کید و رستا۔ عیاذاً باللہ و پناہ بخدا۔ یہاں پہلی نومبر کو بدھ کے دن حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی۔ اور شب کو کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔

نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزند ارجمند خطاب دیا۔ اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ پہلے ہی اس تہنیت میں لکھ چکا ہوں۔

میں نے گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد غدر نثر میں بعبارت فارسی ناآمیختہ بعربی لکھی ہے۔ اور وہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب آگرہ کو مفید الخلائق میں چھپنے کو گئی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے۔ اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدہ کے بیان سے کام رکھا ہے۔

دلی پر پانچ لشکروں کا حملہ

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر میں ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر۔ اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضہ کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا۔ اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں۔ ایک بڑا لڑکا۔ ایک داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

مغل خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے۔ کیونکر لکھوں۔ حکیم رضی الدین خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی۔ اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لیکر آئے تھے۔ غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پر یقین ہے مردہ سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگ گئے تھے وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے۔ اورنگ آباد میں رہے۔ حیدر آباد

میں رہے۔ سالِ گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پاکر ضبط ہوئی۔ اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جسکے کاغذ میاں نظام کی والدہ کے نام کے ہیں وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے ہیں۔ شاید بھاول پور بھی جائیں گے۔

غدر کے بعد جب انگریز پنجاب سے فوج لیکر دہلی پر چڑھے تو انکی فوج کی وردی خاکی تھی۔ اس واسطے شہر میں خاکی کا لفظ ایک اصطلاح بن گیا تھا۔ خاکی کا ذکر درحقیقت انگریز کا ذکر سمجھا جاتا تھا۔

میاں نظام الدین صاحب میاں کالے صاحب کے فرزند تھے ان کی جائداد اورنگ آباد دکن میں بھی ہے۔ میاں سیف الدین وغیرہ اس پر قابض ہیں۔ چالیس ہزار سالانہ کی آمدنی ہے۔ میاں عبدالصمد صاحب دہلوی نے جو میاں نظام الدین صاحب کے نواسہ ہیں اس جاگیر کا دعوےٰ کیا ہے اور آجکل حیدرآباد میں اس کا مقدمہ چل رہا ہے۔

غدر نہیں خدا کا قہر	غلّہ کی گرانی۔ آفت آسمانی۔ امراض دموی بلائے

جانی۔ انواع و اقسام کے اورام و بثور شائع چارہ ناسود مند و سعی ضائع۔ میں نہیں جانتا کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو مہر درخشاں وہ فوج باغی میرٹھ سے دلی آئی تھی یا خود قہرِ الٰہی کا پے در پے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت سابق دلی ممتاز ہے ورنہ سر تا سر قلمرو ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز ہے۔ انا للہ۔

لوٹ کی کتابیں کھتریوں میں کتاب کوئی سی ہو اس کا پتہ کیونکر لگے۔ لوٹ کا مال کھتریوں میں بک گیا۔ اور اگر سڑک پر بکا تو میں کہاں جو دیکھوں ؎

بردل نقش اندوہ گیتی بسر آرید | گیر ید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

یہاں کا قصہ مختصر یہ ہے کہ قصہ تمام ہوا۔

غدر کے بعد ایک چھوٹا سا فساد دلی کا حال تو یہ ہے ؎

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اُسے غارت کرتا | وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا۔ اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے باتفاق رائے ہمدگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔

میاں کالے صاحب کی خانہ ویرانیاں حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ شاہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین کا بھلا حال؟ ایں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو دی۔ کاغذ کا پرزا سوئی کا تار۔ پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ کیا ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے لوگ تمام اُس

موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے۔ اور میدان میں قبر۔ اسکے سوا کچھ نہیں وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہونگے تو خدا ہی جانتا ہو گا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا۔ کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جب یہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں کیا کروں۔ کہیں سے یہ مدعا حاصل ہوسکیگا

حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار پریڈ کے میدان میں جامع مسجد کے شرق کی طرف دو سو قدم کے فاصلہ پر میدان میں واقع ہے۔ پہلے چونہ کا چبوترہ تھا اب سیّد عبد الغنی کلیمی سجّادہ نشین کی سعی سے سنگِ مرمر کی سلیں فرش میں لگائی گئی ہیں۔ یہ علاقہ اب تک فوجی قبضہ میں ہے اور یہاں سائے کی جگہ بنانے کا حکم نہیں ہے۔ نمازی اور زائر نماز و زیارت کے وقت دھوپ کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ پہلے یہاں بڑی بڑی عمارتیں تھیں حضرت شیخ کلیم اللہ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے بڑے نامور، اور صاحبِ تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ تفسیر کلیمی۔ مرقع کشکولِ کلیمی عشرۂ کاملہ۔ مالابد فی التصوف، مکتوبات کلیمی وغیرہ ان کی یادگار کتابیں ہیں حضرت شیخ یحییٰ مدنی چشتی کے خلیفہ تھے۔ اور حضرت نظام الدین اورنگ آبادی انہی کے خلیفہ اورنگ آباد میں مدفون ہیں۔

میاں کالے صاحب کا نام میاں نصیر الدین تھا۔ جو میاں قطب الدین صاحب کے بیٹے اور حضرت مولانا فخر الدین صاحب کے پوتے تھے۔ بہادر شاہ ان کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ ان کے والد کے مرید اور

دادا کے منظورِ نظر تھے۔ ملکہ بیگم ایک شہزادی سے انہوں نے نکاح بھی
کیا تھا۔ قاسم جان کی گلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے محلہ سے غرب کی
طرف کالے صاحب کی حویلی مشہور ہے جس میں آجکل پنجابی تاجر دہلی
کے رہتے ہیں۔ یہ انہی کی تھی۔ اور غدر میں ضبط ہوئی۔ کوتوالی اور شہری
مسجد کے قریب بھی ان کی جائداد کا ذکر غالب نے کیا ہے۔ اب انکے
نواسہ میاں عبدالصمد صاحب پنڈت کے کوچہ میں رہتے ہیں۔ اور دہلی
کے فقرا میں مشہور درویش ہیں۔

دہلی کے مفتیِ اعظم کی بیچارگی

جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی تین سو چالیس روپیہ کی آمد لیکن چونکہ امام بخش چپراسی کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعفِ پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں۔ خدا سلامت رکھے۔ بہت غنیمت ہیں۔

مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور دہلی کے اکابر علما و شرفا
میں تھے۔ حویلی صدر الصدور کا تختہ اب بھی میونسپل کمیٹی کی طرف سے
لکھا ہوا ایک دیوار پر نظر آتا ہے۔ اور جاننے والے کو رُلاتا ہے۔
مٹیا محل کے سامنے ان کا مکان تھا۔ جس میں خان بہادر غلام محمد حسن
خاں رجسٹرار مرحوم کی سکونت تھی اور اب ان کی اولاد رہتی ہے۔

اللہ اللہ مسلمانوں کی غربا پروری کس شان کی تھی کہ مٹنے اور
مٹائے جانے کے بعد بھی جبکہ نوّے برس کے قریب عمر تھی اور صرف
چالیس روپے مہینہ گزراوقات کے لیے باقی بچا تھا۔ مگر اپنے چپراسی
کے کنبہ کو پالتے تھے۔

گردش ایام کا قیدی لفافہ بناتا تھا اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہینگے
مجھکو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے
بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے ورنہ مزہ معلوم ہوتا۔

بقیۃ السیف کا فکر بعد قتل ہونے دس آدمی کے کہ دو اس میں عزیز
بھی تھے۔ یہ سب وہاں سے نکالے گئے۔ مگر صورت نہیں معلوم کہ کیونکر نکلے۔
پیادہ یا سوار تھے۔ تنگدست یا مالدار۔ مستورات کو تو رتھیں دیدی تھیں۔ ذکور
کا حال کیا ہوا۔ اور پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوا۔ کہاں رہے اور کہاں
رہیں گے۔ سرکار انگریزی کی طرف سے مورد تفقّد و ترحّم ہیں یا نہیں۔ رنگ
کیا نظر آتا ہے۔ جبر کسر کی توقع ہے یا نہیں۔ یہ سب اللہ کو معلوم ہے ✦

اب کوئی دوست میرے سامنے نہ مرے

یا اللہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں کوئی میرا یاد کرنے والا۔ اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔ مصطفےٰ خاں خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبسِ ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں۔ احمد حسین میکش مخنوق ہوا (پھانسی پائی) گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں پنشن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بشرطِ اجرابھی میرا کیا گزارہ ہوگا۔ ہاں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام چوٹھے ولدّر نہ ہوگا۔
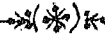
نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بے نظیر شاعر اور خاندانی امیر تھے۔ نواب محمد اسحٰق خاں مرحوم سابق سکرٹری علی گڑھ کالج ان کے صاحبزادہ تھے جنہوں نے ان کے کلام کا مجموعہ چھاپا ہے اور جو "خواجہ ڈپو دہلی" میں بکتا ہے۔ اس مجموعہ میں غدر کے حالات بھی ہیں اور رہائی کا تذکرہ بھی ہے۔

نواب مصطفےٰ خاں اور ان کے لڑکے نواب محمد اسحٰق خاں اپنے خاندان سمیت درگاہِ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں دفن ہیں۔ درگاہ کی بڑی مسجد کے گوشۂ شمال اور سماع خانہ کے غرب میں یہ قبرستان واقع ہے۔ کتبے لگے ہوئے ہیں۔
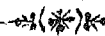
جب شمرات پہ پہرہ لگا یہاں کا حال۔ سخ زمیں سخت ہے آسماں دور ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ تونگر غرور سے مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ آبکاری کے بند و بست جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھنچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازۂ آبکاری ہے۔ اُدھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولوی فضل رسول صاحب حیدرآباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔ محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے۔ پر یہ نہ معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔

دوستوں سے ملنے میں بھی دشواری تھی حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جوان پہ متعین تھا، اُٹھ گیا۔ اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو۔ مگر شہر میں سے باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ۔ اور ہر ہفتہ میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔ چنانچہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے مرزا جاگن کے مکان میں آ رہے ہیں۔ صفدر میرے پاس آیا تھا یہ اس کی زبانی ہے۔ جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از راہِ احتیاط جا نہیں سکتا۔ مرزا بہادر بیگ نے بھی رہائی پائی۔ اب اس وقت سُنا ہے کہ وہ خانصاحب کے پاس آئے ہیں یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائینگے۔ یہاں نہ رہیں گے۔

مٹنے والوں کے گھروں میں کون رہتا تھا قاسم جان کی گلی میر خیراتی کی پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسن خاں کی حویلی ہسپتال ہے۔ اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں۔ اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب

عالیشانِ انگلستان تشریف رکھتے ہیں ضیاء الدین خاں اور ان کے بھائی مع قبائل اور عشائر لوہارو ہیں۔ لال کنوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے۔ آدمی کا نام نہیں۔ کھمبی کی دکان ہیں گتے لوٹتے ہیں۔

مجھے عوام کے نقشہ میں نہ لکھو

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے۔ اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازہ کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ یا دو دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا اور نہ گوروں کے زمانے میں نکلا۔ اور نکالا گیا۔ کرنیل براون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکمِ وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے نقشہ کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو۔ اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو

اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ مقرر کرنا حاکم کی رائے پر ہے روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے۔ آپ شہر میں آباد ہو جائیے آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں۔ یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں الملک للہ والحکم للہ۔

کیسی بیکسی میں وہ لوگ تھے جنہوں نے غدر کے بعد کا یہ دم گھونٹنے والا تماشہ دیکھا۔ اور کیسے نادان ہم لوگ ہیں کہ پھر بے امنی کی تمنائیں کرتے ہیں۔ انسان متلوّن مزاج اور جلدی بھول جانے والا واقع ہوا ہے۔ امن کی برابر دنیا میں کوئی چیز اچھی نہیں ہے۔

سوسائٹی کی بربادی کا ماتم

اس چرخ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال۔ جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے ؎

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک　　اور تو یہاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔ کل سے مجھ کو سیکش بہت یاد آتا ہے۔ وہ صحبتیں اور تقریریں۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کا نہیں کر سکتی۔

ہیکش کے پھانسی پانے کے بعد عالمِ غم و الم میں یہ تحریر لکھی گئی ہے
ہائے کتنا درد حرف حرف کے کلیجہ میں بھرا ہے۔ پڑھکر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

دہلی سے انتہائی محبت اسکے اُجڑنے کی خاک بھی آنکھوں میں

آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں۔ جتنی گرد اُڑی اس سب کو ازراہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔

دہلی سے محبت کرنے کی یہ انتہائی مثال غالب نے لکھی ہے۔ کہ آنکھیں دُکھنے آئیں تو اس کا سبب یہ قرار دیا کہ دہلی کے مکان اُجاڑے گئے اور ان کے مٹنے سے خاک اُڑی تو اس کو آنکھوں میں بٹھالیا۔ گو اسکے اثر سے آنکھیں دُکھنے لگیں۔

اپنے وطن سے محبت اس طرح کیا کرتے ہیں۔ کوئی آجکل کے محبانِ وطن کو غالب کے یہ چند لفظ سُنادے۔

غالب کو کنوؤں کا غم

اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں۔ یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں۔ یا گورے ہیں۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ خس کی ٹٹی، پُروا ہوا۔ اب کہاں؟ لطف تو وہ اُسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہرحال بیگزرد مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا

لال ڈگی کے کنوئیں یکقلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوئیں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راجگھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہوا کا مکان ہو جائے۔ مرزا گوہر کے باغیچہ کے اُس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راجگھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہتے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ۔ دھوبی واڑہ۔ رامجی گنج۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی۔ رامجی داس گودام والے کے مکانات۔ صاحب رام کا باغ۔ حویلی۔ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائیگا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد اُردو بازار نہ رہا۔ اُردو کہاں۔ دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ۔ نہ شہر۔ نہ بازار۔ نہ نہر۔

اس عبارت میں غالب نے دہلی کی اُن شاندار عمارات کی بربادی کا نقشہ کھینچا ہے جن میں سے اکثر کے نام سے بھی اب دہلی والے واقف نہیں۔ اور میں بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں تھیں۔

معلوم ہوتا ہے غالب کو سب سے زیادہ کنوئیں کے بند کر دینے کا

صدمہ ہے۔ وہ یہ سُنکر کہ کنوئیں بند کیے جا رہے ہیں خود گھر سے نکلے تاکہ اپنی آنکھ سے دیکھیں۔ حالانکہ ان کا گھر سے نکلنا آجکل کی طرح کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مشرق والے خصوصاً ہندوستان اور دہلی والے کنوؤں کے پانی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اور ان کو نلوں کے پانی سے کسی قسم کی محبت نہیں ہے۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی (مرحوم) بھی ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا　　پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
پیٹ چلتا ہے۔ آنکھ آئی ہے　　شاہ ایڈورڈ کی دُہائی ہے

انگریزوں نے حفظِ صحت کے خیال سے کنوئیں بند کیے تھے کہ ان کا پانی جلد خراب ہو جاتا ہے۔ مگر اہلِ مشرق اپنی پُرانی عادات کے خلاف کسی مصلحت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

تحریر کے شروع میں غالب نے دہلی کی آبادی کے بارہ میں یہ لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسی جماعتیں وہاں آکر آباد ہو گئی تھیں جنکو زبان اور تہذیب و علم سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اس لیے آجکل دہلی کی بگڑی ہوئی زبان پر اعتراض کرنا بھی فضول ہے کہ یہ زبان اہلِ دہلی کی نہیں ہے وہ تو پھانسی پا گئے اور جو لوگ یہ زبان بولتے ہیں وہ دہلی والے نہیں ہیں پردیسی ہیں +

دہلی کی بہاروں کا فشار اور غالب کی آہِ شرر بار | دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ[1] چاندنی چوک[2]۔ ہر روز مجمع بازار مسجدِ جامع[3] کا

ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر۔ بہادر گڑھ۔ بلب گڈھ۔ فرخ نگر۔ دوجانہ۔ پاٹودی۔ لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے انمیں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار۔ پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں۔ بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم اسد تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم ؎

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

جان نثار خاں کے چھتے کا ڈھنا۔ خان چند کے کوچہ کا سٹرک بننا۔ بلاقی بیگم کے کوچہ کا مسمار ہونا۔ جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا۔ اور غالب افسردہ دل۔

دہلی کی پانچ بہاروں کا کس درد سے ذکر کرتے ہیں۔ چاندنی چوک کی وہ رونق جاتی رہی قلعہ میں گورے آباد ہو گئے۔ جمنا کے پل کی سیر کا اب کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ پہلے وہاں آٹھویں دن میلہ لگتا تھا۔ جامع مسجد کے سامنے شام کو اب بھی بازار لگتا ہے۔ مگر پہلی سی بہار نہیں ہے۔ پھول والوں کی سیر اب بھی سال بسال ہوتی

ہے لیکن اگلی سی آن بان کہاں۔

جھجر والے نواب اور بلبگڈھ کے راجہ نے غدر کے بعد دہلی میں پھانسی پائی۔ جھجر ضلع رہتک میں شامل ہوا۔ اور بہادر گڑھ بھی۔ اور بلبگڈھ ضلع گڑگانوہ کو دیدیا گیا۔

یہ عبارت غالباً ۱۸۵۸ء کے آخر میں لکھی گئی ہے کیونکہ گورنر نے میرٹھ میں دربار دسمبر ۱۸۵۸ء میں کیا تھا جس کا ذکر غالب نے کیا ہے۔

آخر کی عبارت اس قدر دردناک ہے کہ پتھر کا کلیجہ رکھنے والا بھی بے اختیار رو دیگا۔ خبر نہیں غالب کے دل پر کیا کیا اثر یہ انقلابات پیدا کرتے ہونگے جب ہی تو ان کے قلم سے یہ مجروح کرنے والے الفاظ نکلے۔

برٹش طرز حکومت پر چوٹ | سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملیگا مگر وہ اختیار ایسا ہوگا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا۔ آدمی کو بدنام کیا ہے۔

یہاں مہاراجہ الور کے اختیار کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر برطانی آئین سلطنت پر ایک پر لطف ضرب بھی لگاتے ہیں۔ کہ وہ والیان ریاست کو ایسا اختیار دیتا ہے جیسا خدا نے بندوں کو اختیار دیا ہے

کہ مجبور بھی ہیں اور مختار بھی۔

غالب نے اس وقت یہ عبارت لکھی کہ مشرقی آئین سلطنت لوگوں کے دل ودماغ پر مسلط تھے اور خلقت انہی کو اچھا سمجھتی تھی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو مان جاتے کہ پرانا دستور امن کے لیے اتنا مفید نہ تھا جتنا نیا آئین ثابت ہوا۔ والیان ریاست کو مطلق العنان کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ بغاوتیں کرتے رہتے تھے۔ اور سلطنت کو بھی دشواریاں پیش آتی تھیں اور رعایا بھی تباہ ہوتی تھی۔ انگریزوں کے آئین جدید نے اس خرابی کا قطعی سد باب کر دیا۔ اور اب غدر ۵۷ء کے بعد سے کسی ریاست کو سرکشی و بغاوت کا حوصلہ نہ ہوسکا اور ملک میں امن قائم ہو گیا۔ اس واسطے ہر شخص برٹش آئین کے اس عاقلانہ حصہ کو امن کے خیال سے پسند کرتا ہے اور یہ برائی کی چیز نہیں سمجھی جاتی۔

تاج محل کی رہائی چوک میں بیگم کے باغ کے دروازہ کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ وخشت وخاک ڈال کر بند کر دیا بلیماروں کے دروازہ کے پاس کئی دوکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا شہر کی آبادی کا حکم خاص و عام کچھ نہیں ہے۔ پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل۔ مرزا قیصر۔ مرزا جواں بخت کے سالے ولایتی بیگم اور جھجر کی زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ دیکھیے کیمپ میں ہیں

یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلّی کے خبر ترا شوں کا دستور ہے یہ بات اُڑا دی ہے۔ یہ سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں عموماً شہر میں آباد کیے جاوینگے۔

یہ عبارت ۱۲ دسمبر ۱۸۵۸ء کی لکھی ہوئی ہے۔ تاج محل بہادر شاہ کی بیگم تھیں۔ زینت محل کا کمرہ لال کنوئیں اور فراش خانہ کے وسط میں سبزی بازار واقع ہے۔ اسکے شاندار دروازہ پر بہادر شاہ کی کہی ہوئی اور خاص ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخ کندہ ہے۔ یہ عالیشان عمارت آجکل مہاراجہ پٹیالہ کے قبضہ میں ہے۔ غدر کے ایام میں جو امداد انہوں نے انگریزی فوج کی کی تھی اس کے انعام میں یہ مکان ان کو دیا گیا تھا۔

تاج محل کا خوبصورت مکان کٹڑہ خوش حالی رائے میں تھا۔ جو ہندؤں کے مشہور محلہ مالی واڑہ کے قریب واقع ہے۔ یہ مکان اب بھی موجود ہے اور اس میں دہلی کے مشہور ساہوکار لالہ رام کشن داس رہتے ہیں جن کے ہاں چاندی سونے کا بیوپار ہوتا ہے۔ لالہ صاحب نے اس کی قدامت کی خوبصورتی کو بھی باقی رکھا ہے اور جدید خوشنما اضافے بھی کیے ہیں۔ مگر زینت محل کے کمرہ میں ریاست پٹیالہ نے کوئی ترقی نہیں کی بلکہ سابق کے آثار میں بھی بوسیدگی واقع ہو رہی ہے اور یہ تاریخی مکان چند دن کا مہمان ہے۔

جامع مسجد کی رہائی مسجد جامع واگزاشت ہوئی۔ چیلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دوکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے مرزا الٰہی بخش۔ مولوی صدرالدین۔ تفضل حسین خاں تین یہ۔ سات اور۔ ۷ نومبر ۱۴ جمادی الاوّل سالِ حال جمعہ کے دن ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رہا ہوئے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔

جامع مسجد دہلی کے واگزاشت کرانے میں خان بہادر شیخ الٰہی بخش صاحب مرحوم رئیس میرٹھ نے دو لاکھ روپیہ یا اسی کے قریب سرکار کو دیا تھا جب اس کو رہا کیا گیا تھا۔ فتح دہلی کے بعد جامع مسجد میں گورے سپاہی رہتے تھے۔

جامع مسجد ایام غدر میں باغیوں کا مرکز سمجھی گئی تھی۔ جب انگریزی فوج نے پہلا دھاوا شہر پر کیا تو وہ جامع مسجد تک آگئی تھی۔ مگر جمعہ کی نماز کے لیے جو مسلمان اس وقت وہاں جمع ہوئے تھے انہوں نے باہر نکل کر فوج کا مقابلہ کیا۔ اور ایسے لڑے کہ فوج کو کشمیری دروازہ تک واپس جانا پڑا اور دوسرے دن دوبارہ حملہ کر کے دہلی فتح کر لی۔ جمعہ کی لڑائی میں میرے والد موجود تھے۔ ان سے میں نے یہ قصّہ سُنا۔ اور یہی وجہ جامع مسجد کے قبضۂ فوجی کی تھی۔

میکش پھانسی سے پہلے میکش جیل میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے سُلطانجی

میں تھا۔ اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا بی بی کو اور لڑکے کو بہرام پور میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔

یہ تحریر اُس وقت کی ہے جبکہ میکش زندہ تھے۔ اور غدر کی شرکت کا ان پر الزام نہ لگایا گیا تھا۔ درگاہ حضرت سلطان جیؒ میں رہتے تھے۔ مگر بعد میں ان کو بغاوت کے شبہ میں گرفتار کیا گیا۔ اور پھانسی دی گئی۔ اسی روزنامچہ میں غالب نے کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔

میکش کے باپ گولی سے قتل ہوئے اور ان کو پھانسی دی گئی۔

کشمیری کٹرہ کی مسماری

کشمیری کٹرہ گر گیا ہے، وہ اونچے اونچے در، اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دور دیہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔

پریڈ کے میدان کو دربار ۱۹۱۱ء کے ایام میں جب ہموار کیا جا رہا تھا تو سینکڑوں مکانات کے آثار دبے ہوئے نکلتے تھے۔ یہاں تک کہ چارپائیوں کے پائے۔ آٹا گوندھنے کے کونڈے اور گھروں کے برتنے کی چیزیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب یہاں کے بازار اور محلّے مسمار کیے گئے تو رہنے والوں کا سامان بھی اس میں دب گیا۔

خیال یہ تھا کہ گنجان محلّوں اور بازاروں کا توڑنا ہوا صاف کرنے

کے لیے تھا مگر سلطنت نے یہ نشانیاں دیکھکر کہا جاتا تھا کہ مسماری جوش انتقام سے بھی تعلق رکھتی تھی جب ہی تو اس بے دردی سے خانہ زادی کے اسباب کو بھی ملیا میٹ کر دیا گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب جب اس تباہی کا ذکر لکھتے ہیں تو ان کا قلم آنسو بہاتا جاتا ہے۔

جب دہلی پر ٹیکس لگائے گئے

شہر میں "پون ٹوٹی" کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فیٹ گول میدان نکلے گا۔ دُکانیں۔ حویلیاں ڈھائی جاویں گی۔ دار البقا فنا ہو جائیگی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑھ تک ڈھےئے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے۔

پون ٹوٹی (چنگی) کوئی چیز ہے۔ کہکر غالب نے تڑپا دیا۔ طعن کا نہایت پُر لطف انداز ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے ہر چیز پر ٹیکس (محصول) لگ جاتا غالب جیسے شخص نے یقیناً نہایت حقارت سے محسوس کیا ہوگا چار پانچ فقروں میں نئی حکومت کے طرز حکمرانی کو بیان کر دینا غالب ہی کا کام تھا۔

دہلی کے غارت شدہ بازار

شہر ڈھہ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار۔ اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا

اب یہ بھی نہیں کہ کہاں تھے صاحبان امکنہ و دوکانیں نہیں بتا سکتے کہ ہمارا امکان کہاں تھا اور دُکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ آب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ موے کے مول اناج بکتا ہے ماش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ بارہ سیر۔ گیہوں ۱۳ سیر۔ چنے ۱۶ سیر۔ گھی ۱½ سیر

یہ تینوں بازار دریا گنج (فیض بازار) کی سڑک کے خاتمہ سے شروع ہوتے تھے۔ جہاں اب پریڈ باغ۔ ایڈورڈ پارک۔ وکٹوریہ ہسپتال اور پریڈ کا میدان واقع ہے۔

اس وقت کی گرانی جس کا حال لکھکر غالب حیران ہیں آجکل کی گرانی کے مقابلہ میں ارزانی ہے۔ اب ماش کی دال ۳ سیر۔ گندم ۴ سیر باجرہ ۴ سیر اور گھی آدھ سیر ہے۔

بہادر شاہ پر سکہ کہنے کا الزام سکہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا کہ جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں۔ کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دونوں سکے کہکر گزرانے بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر[۱] جو ذوق کے معتقدین میں تھے۔ اُنھوں نے اپنے دلی اُردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب وہ لوگ بھی موجود

---

[۱] مولوی محمد باقر غالباً شمس العلما مولینا محمد حسین آزاد کے والد یا کوئی عزیز ہونگے۔ انکے اُردو اخبار کا ذکر غدر کے اکثر حالات میں آتا ہے۔ (حسن نظامی)

ہیں کہ جنھوں نے اس زمانہ میں مرشدآباد اور کلکتہ میں یہ سکے سُنے ہیں۔ اوران کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہرچند قلمرو ہند میں دلّی اُردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی۔ اور وہ ریاست کا نام ونشان خلعت و دربار بھی مٹا۔

سکّے کی حقیقت لکھنے میں جو سادہ پُراثر اور شاعرانہ تلازمہ برتا گیا ہے وہ زبانِ غالب کا بہترین نمونہ ہے ناظرین غور سے دیکھیں۔

داغ وارد ہلی رفع فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلم۔ یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے۔ یہ داغ انکی جبینِ حال سے عموماً مٹ نہیں سکتا۔

دہلی میں مارشل لا رہنا شہر میں بے حصولِ اجازتِ حاکم احتمالِ ضرر رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو۔ اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔ دلّی کی عملداری میرٹھ و آگرہ اور بلادِ شرقیہ کے مثل نہیں ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے نہ قانون نہ آئین جس حاکم کی جو رائے میں ہو وہ ویسا ہی کرے۔

غالب نے مارشل لا کے چہرہ کو جگہ جگہ جس اختصار اور جس احتیاط مگر جس بیباکی سے لکھا ہے وہ آجکل کے سیاست نگاروں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔

امن کے اشتہار کے بعد حکم عفو تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلات حرب و پیکار و بیجمہ توقیع آزادی پاتے ہیں

یہ عبارت ۱۰ ر نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب باغیوں کو امن مل گیا تھا۔ مگر اس کے بعد ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء تک غالب کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے اندر مسلمانوں کو بغیر ٹکٹ کے آنے کی اجازت نہ تھی۔ غالباً انتظاماً بعض حکام مقامی نے ایسا کیا ہوگا۔ ورنہ ملکہ وکٹوریہ امن عام کا اشتہار دے چکی تھیں جو ۱۸۵۸ء میں شائع ہو گیا تھا۔

اِمدادی خرچ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا باقی چڑھے ہوئے روپئے کے باب میں اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ سوال امیر خسرو رح کی انملی ہے" چیل بسولا لیگی تو کا ہے پھیکوں رب" آ۔ علی بخش خاں پچاس روپئے مہینا پاتے تھے۔ بائیس ۲۲ مہینے کے گیارہ سو روپئے ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپئے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں غلام حسن خاں سو روپئے مہینے کا پنشن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپئے ہوتے ہیں، اس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپئے مہینا۔ بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں۔ اس کو اٹھارہ سو ملے۔ منا جمعدار دس روپئے مہینے کا سکھ لمبر سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے آئندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو پھر مدد خرچ نہیں ملا جب کئی خط پر خط لکھے

تو آخر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مددخرچ سو روپے ملجاویں
ہیں سے وہ سو روپے نہ لیے۔ اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے
آٹھ آنے مہینا پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں
سب پنشن داروں کو سال بھر کا روپیہ مجھکو سو روپے کیسے ملتے ہیں۔ مثل اوروں کے
مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جاوے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔ آبادی کا
کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈھورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر بطریق ڈاک
کلکتہ چلے گئے۔ دلی کے حمقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں منھ کھول کر رہ گئے۔ اب
جب وہ معاودت کرینگے تب شاید آبادی ہوگی۔ یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے

یہ تحریر فروری سنہ ۱۸۵۹ء کی ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ
سنہ ۱۸۵۸ء میں اشتہار امن کے بعد بھی حکامِ انتظامی نے دہلی کے آباد ہونے
میں احتیاط کی تھی۔

دربار میں غالب تھے اور مہاجن

رگِ قلم کی خونابہ فشانی دیکھو۔ گورنر
اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں
میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے ان کو حکم دیا اور دربار عام میں سے سوائے میرے
کوئی نہ تھا۔ یا چند مہاجن۔ مجھکو حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب
ملا کہ اب نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی عادت قدیم کے موافق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی
اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا چیف سکرٹر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا

کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اِس وقت فرصت نہیں۔ دوسرے دن پھر گیا میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اختلاط رکھتے تھے اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھکر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اختلاط مظنۂ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اِس کی تحقیقات ہو۔ تاکہ میری صفائی اور بیگناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہِ گزشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کرینگے۔ پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار و خلعت مسدود۔ پنشن موقوف۔ وجہ نامعلوم۔ لاموجود الا اللہ و لا موثر فی الوجود الا اللہ۔ ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علیخاں بہادر والیِ رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے میں اصلاح دیکھکر بھیج دیتا۔ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری انگریزی پنشن کھلا ہوا۔ ان کے عطایا۔ فتوح گنے جاتے تھے جب یہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔ چھ سات ہفتے وہاں رہکر دلی آیا۔

غالب کے استقلال نے فتح پائی

۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے آنا

کہ میں بھی چلوں۔ فرمایا کہ نہیں جب لشکر میرٹھ سے دلی میں آیا موافق اپنے دستور
کے روز ورود لشکر مخیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ ان کے خیمہ سے اپنے
نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے زمانہ
میں بادشاہی باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں
ہیں گدا مجرم اس حکم پر ممنوع نہ ہوا جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے میں نے
قصیدہ حسب معمول قدیم بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ آپ یہ چیزیں ہمارے
پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوس مطلق ہو کر بیٹھ رہا۔ اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا۔
واقع اواخر ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب
دلی آئے۔ اہالیان شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر کے پاس دوڑے
اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانۂ محض اور مطرود حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا۔ کسی سے
نہ ملا۔ دربار ہوا، ہر ایک کامگار رہا۔ شنبہ ۸ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ
صاحب کے خیمہ میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر پاس بھیجا
بُلایا گیا۔ مہربان پا کر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔
وہ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ بقیہ
روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں
اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے
گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے
پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آ کر تمہارے
علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے۔ اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ

اسد اللہ خاں کا دربار اور تمبر او خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۱۴ دن یا ۱۵ دن بعد ادھر کو روانہ ہوئے ہیں میں نے کہا سبحان اللہ ؎

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما　　　فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

سہ شنبہ ۲۳ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھکو بلایا۔ خلعت عطا کیا۔ اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار و خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار و خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا حضور کے قدم دیکھے خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا۔ نہال ہو گیا۔ اب انبالہ کہاں جاؤں جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا ؎

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد　　　ہر چہ گیرید مختصر گیرید

سر ولیم میور اور غالب

پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند۔ اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔ پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکام پہ مدار ہے۔ سو ان کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں، نہ جواب، نہ مہربانی، نہ عتاب خیر۔ اس سے قطع نظر کی سنہ ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر اودھ عطیۂ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔ اگر گنہگار ٹھہرتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشگاہِ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھیجا ایا ہے بقلم چیف سکرٹر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ ابکی بار دو کتابیں بھیجیں۔ ایک پیشکش گورنمنٹ

اور ایک نذر شاہی ہے نہ اسکے قبول کی اطلاع۔ نہ اُسکے ارسال سے آگاہی ہے جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھکو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف۔ اب خبریں ہیں مختلف۔ کہتے ہیں کہ چیف سکرٹر بہادر لفٹنٹ گورنر ہو گئے یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالیشان چیف سکرٹر ہوئے۔ مشہور جناب ولیم میور صاحب بہادر صدر بورڈ میں تشریف لے گئے یہ کوئی نہیں کہتا کہ لفٹنٹ گورنری کے سکرٹری کا کام کس کو دے گئے۔

انگریزوں کے احسان کی یاد شریف ہندوستانی کے دل میں

جناب آرنلڈ صاحب بہادر آج تشریف لے گئے۔ سُنتا ہوں کہ کلکتہ جائیں گے میم اور بچّوں کو ولایت بھیجکر پھر آئیں گے۔ مجھ سے وہ سلوک کر گئے ہیں۔ اور مجھ پر وہ احسان کر گئے ہیں کہ قیامت تک ان کا شکرگزار رہونگا۔

غدر میں تم کہاں تھے

خدا جب کا بھلا کرے۔ مجھکو ڈپٹی کمشنر نے بُلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ غدر میں تم اول تھے؟ جو مناسب ہوا وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدہ ولایت میں نے پڑھائے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ انداز ادا سے پنشن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے۔ مگر پندرہ مہینے پچھلے ملتے نظر نہیں آتے۔

غالب کی مفلسی کوتوالی میں

یہ تو آفت دلّی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے:۔

"ٹکٹ آبادی درونِ شہر دہلی بشرطِ ادخالِ جرمانہ"۔ مقدار روپئے کی حاکم کی رائے

پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھیے یہ کاغذ کیونکر تقسیم ہوں۔ یہ تو کیفیت شہر کی ہے۔ میرا حال سنو بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کو حکم آیا ہے کہ اسداللہ خاں پنشن دار کی کیفیت لکھو۔ کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے کہ نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطہ کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے۔ اور میری بےمقدوری ظاہر کرائیں گے۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائیگا۔ اور آئندہ کو پنشن جاری ہو جائیگا۔

کوتوالی میں اظہارِ مفلسی کے واقعہ کو کس رقّت خیز انداز سے لکھا ہے کہ مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔ اس پر بھی یہ یقین نہیں کہ نتیجہ مفید نکلیگا۔

شرفا کی تصویرِ افلاس

پنشن کا حال کچھ معلوم نہیں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملہ میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہرحال اتنا سُنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ پس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم نہ کسی کو خبر۔ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤنگا۔

یہ غالب نے اپنا ہی حال نہیں لکھا بلکہ غدر کے بعد جو حالت شرفائ

دہلی کی ہوگئی تھی اُس کی تصویر بھی دکھادی ہے۔

جو لوگ بے امنی کے خواستگار ہیں۔ اِن حالات کو ذرا نظرِ عبرت سے پڑھیں۔

گورنر جنرل نے غالب کی قدردانی کی

صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھکو بُلایا۔ پنجشنبہ ۲۴ر فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ر فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسشِ مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اُٹھا کر پڑھتے رہے جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے منگلوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک منگلوڈ صاحب دیکھنے کو مانگتے ہیں اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا۔ کل حاضر کروں گا۔ پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا۔ اور خوش آیا۔ حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر۔ کتابوں سے کیا اطلاع۔ پنشن کی پرسش سے کیا مُدعا۔ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل ہوا ہے۔ اور یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔

کتاب دستنبو نے گورنر جنرل کے خیالات غالب کی طرف متوجہ

کیے۔ جیسا کہ میں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ اِس عبارت سے اِس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔

سنہ ۱۸۶۰ء میں املاک واگزاشت دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا دلّی کے علاقہ کے جاگیردار بموجب حکم کمشنر دہلی میرٹھ گئے۔ موافق دستور قدیم ہل آئے۔ غرضکہ پنجشنبہ ۲۹ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو گیا۔ میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھکر صاحب سکرٹر کو خبر کروائی۔ یہ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سُنکر نومیدی کی پوٹ باندھکر لے آیا۔ ہر چند پنشن کے باب میں ہنوز لا و نعم نہیں مگر کچھ فکر کر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام نہیں۔ ممکن تحریر ڈاک میں بھیجی جائیگی۔ دیکھیے کیا صورت پیش آئیگی۔ مسلمانوں کی املاک کے واگزاشت کا حکم عام ہو گیا ہے۔ جن کو کرایہ پر ملی ہے ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔ آج یکشنبہ یکم جنوری سنہ ۱۸۶۱ء ہے۔ پہر دن چڑھا ہے

سنہ ۱۸۵۸ء کے اعلان ملکہ وکٹوریہ سے صرف جاں بخشی ہوئی تھی۔ جائداد کی رہائی خصوصاً مسلمانوں کی املاک کی واگزاشت سنہ ۱۸۶۰ء میں ہوئی جیسا کہ غالب نے لکھا ہے۔

گورنر غالب کے بسیار مہربان دوستان | نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب وشمال کو نسخۂ دستنبو بسبیل ڈاک بھیجا تھا۔ اُن کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت و قبول صدق ارادت و مودت بسبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا گیا۔ اس کی رسید آگئی۔ وہی خاں صاحب بسیار مہربان دوستان القاب اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر کل مجھ کو آگیا۔ پنشن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔

اِس عبارت سے کئی باتیں نئی معلوم ہوئیں۔ ایک تو گورنر کا فارسی میں خط لکھنا۔ دوسرے مشرقی القاب سے مخاطب کرنا۔ تیسرے مشرقی یعنی افشانی کاغذ پر خط لکھا جانا۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ غدر کے بعد سے انگریزوں نے یہاں کے رسم و رواج کو کتنا زیادہ ترک کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ ان کے غیر ہر دل عزیز ہو جانے کی ہے۔

غالب نے ہر جگہ پنشن کو مذکر لکھا ہے۔ مگر یہاں مؤنث لکھتے ہیں۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ پنشن کا استعمال دونوں طرح جائز ہے۔

سر جان لارنس اور غالب | عرضی میری سر جان لارنس چیف کمشنر بہادر

کو گزری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمۂ سائل بھیجت جائے اور یہ لکھا جائے کہ بمعرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر چارلس سانڈرس کو لکھا۔ اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیجدی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو ان کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا جو اس کو دیکھیں گے۔ بہرحال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا نام کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا۔ اور میں حکام کے نزدیک بیا تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔ اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

افلاس شاعری پر بھی غالب ہے ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار و خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا۔ اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھکو بلا بھیجا۔ بہت ہی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کرینگے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ

جائیں گے۔ دلّی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا تم بھی انبالہ جاؤ۔ شریک دربار ہوکر خلعت معمولی لے آؤ۔ کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری۔ گویا مُردہ جی اُٹھا مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سنّاٹا گزرا کہ سامانِ سفرِ انبالہ و مصارفِ بے انتہا کہاں سے لاؤں۔ اور طرّہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدہ کی فکر۔ اُدھر روپیہ کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے۔ وہ روپیہ کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا +

دن کی روٹی رات کی شراب

بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے۔ وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الٰہی بخش جو شاہزادوں میں ہیں۔ ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھیے کیا حکم ہو۔ حکیم جی کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں۔ ع

تو بیکسی و غریبی ترا کہ می پرسد

نہ جزا۔ نہ سزا۔ نہ نفرین۔ نہ آفرین۔ نہ عدل۔ نہ ظلم۔ نہ لطف۔ نہ قہر۔ ۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ شراب نہیں۔ کپڑا ایامِ تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر نہیں +

حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی نسبت دلّی میں مشہور رہا تھا کہ وہ بھی جلا وطن کیے جائینگے۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔ میرزا الٰہی بخش

کی جلاوطنی منسوخ ہوئی۔ اور وہ مرتے دم تک درگاہ حضرت سلطان جیؒ
میں رہے۔ غالب کی قبر کے پاس ان کا شاندار مکان بنا۔ جواب کھنڈر
پڑا ہے۔ جلاوطنی ہی منسوخ نہیں ہوئی بلکہ بارہ سو روپئے ماہوار پنشن
بھی نسلاً بعد نسل دی گئی۔ جو ان کے بیٹوں میرزا سلیمان شکوہ عرف
بڑے میرزا اور میرزا ثریا جاہ اور میرزا اقبال شاہ میں تقسیم ہوئی۔
اور اب میرزا ثریا جاہ کے مرنے کے بعد ان کی بیگمات و ورثا کو ملتی ہے
میرزا الٰہی بخش اور ان کے لڑکے درگاہ حضرت سلطان جیؒ کے شرقی
رُخ سنگِ سُرخ کی جالیوں کے اندر دفن ہیں۔ میرزا الٰہی بخش
آخر میں خیرخواہِ سرکار ثابت ہوئے تھے۔ بہادر شاہ کے سمدھی تھے۔

غدر کے دفترِ شاہی میں غالب کا نام نہ تھا

دفترِ شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا کسی
مخبر نے نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں
دی۔ حکامِ وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش
نہیں ہوں۔ بُلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو
تو بُلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بُلایا نہیں گیا۔ خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی
حاکم سے نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی۔
مئی سے پنشن نہیں پایا۔ یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہونگے۔ انجام کچھ نظر
نہیں آتا۔

غالب کی جان پٹیالہ کے سبب بچی

میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں

تو۔ دس۔ برس سے کرایہ کو رہتا ہوں۔ اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بدیوار ہیں۔ گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبانِ عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقت غارت دلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولتمند۔ اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصّل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پہ شدت ہے۔ اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک ہو رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اسکو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا۔ اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکّام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کی بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی۔ لہٰذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی۔ غرضکہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بند و بست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھکو نہیں معلوم۔ بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکّام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار

کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر تک کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں؟

پنشن کی نسبت میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا بارے وہ نقشہ پنشنداروں کا جو یہاں سے بنگر صدر کو گیا تھا۔ اور یہاں کے حاکم نے نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا۔ کہ یہ شخص پانے کا مستحق نہیں ہے گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میری پنشن کے اجرا کا حکم دیا۔ اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا۔ میں نے بھی سنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آئندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیے پچھلے روپے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

دہلی کا دردناک مرثیہ ۵

بسکہ فعال ما یرید ہے	ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے	زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے	گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک	تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یہاں تک	آدمی واں نہ جا سکے یہاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا	وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ	سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم	ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالب	کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

یہ مرثیہ محض شاعری نہیں بلکہ واقعاتِ غدر کی
تاریخی تصویر ہے۔ چاندنی چوک میں پھانسیاں کھڑی ہوئی
تھیں جن پر روزانہ سینکڑوں آدمیوں کو لٹکایا جاتا تھا
مسلمانوں کے ساتھ خصوصیت سے سختی برتی جاتی تھی۔
انہی امور کو غالب نے غمناک انداز سے لکھا ہے۔

انگریز بھی غالب کے شاگرد تھے

جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں ع

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اُس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریزی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

غالب کی انصاف پسندی دیکھنا۔ غدر کے مصائب کو بلا تعصب بیان کرتے ہیں۔ انگریزوں پر جو مظالم ہوئے ان کو بھی قلم پر لاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غدر سے پہلے انگریز دیسی شعرا کے شاگرد ہوتے تھے۔ اور شرفا سے دوستیاں کرتے تھے۔ اب یہ باتیں کہانیاں ہوگئیں +

غالب انگریزوں کے خیر خواہ تھے حکم ہوا ہے کہ دوشنبہ کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہانِ انگریز اپنے اپنے گھروں میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔

فقیر بھی اِس تہیدستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا +

اِس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جو کہیں کہیں انگریزوں کے خلاف الفاظ استعمال کیے ہیں یہ اُس وقت کی عام زبان تھی ورنہ جشن میں شرکت گھر پر روشنی کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ حکومت سے عناد نہ رکھتے تھے +

تمام شد

جری محمد ۱۹۴۱ء

خلاصہ کتاب دستنبو کا ترجمہ

میں حامیانِ اُردو کی طرف سے جناب میرزا یعقوب بیگ صاحب نامی ایم-اے بی-ٹی دہلوی کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اپنے جدِ امجد دبیر الملک میرزا غالب کی مشہور کتاب دستنبو کا اُردو ترجمہ کر دیا اور جس بے نظیر چیز کا کتاب ہٰذا کے شروع میں غالب نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے وہ لباسِ اُردو پہنکر ناظرین کے سامنے آگئی۔

جناب نامی کے دادا جناب میرزا فتح اللہ بیگ المعروف بہ میرزا رجب بیگ مرحوم میرزا غالب کے چچازاد بھائی تھے۔ نامی صاحب میں بھی باوجود انگریزی کا اعلیٰ تعلیمیافتہ ہونے کے اپنے اجداد کی طرح سپاہیانہ ولولہ اور شاعرانہ نزاکت طبع پوری آن بان سے موجود ہے۔ انہوں نے کتاب دستنبو (جسکے معنی گلدستہ کے ہیں) کا وہ تمام ضروری خلاصہ لے لیا ہے جسکا تعلق غدر کے احوالِ تاریخی سے تھا۔ اور کمال یہ ہے کہ ترجمہ ایسا سلیس اور صاف کیا کہ بالکل غالب کا رنگ معلوم ہوتا ہے اور مفہوم کتاب کی ادائگی میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ غالب نے ایامِ غدر میں یہ کتاب لکھی تھی جبکہ شرفا و خصوصاً مسلمانوں کا سانس خوف و مایوسی سے گھٹ رہا تھا۔ اس واسطے اگر انکی رائے میں مصلحتِ وقت کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آئے تو موجودہ نسلوں کو اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ غالب نے باوجود نزاکتِ وقت بعض باتیں ایسی آزادی و بیباکی سے لکھدیں کہ کوئی دوسرا لکھنا چاہتا تو دار و گیر کے اُن ہولناک قیمتوں میں نہ لکھ سکتا۔

دستنبو کا مروجہ نسخہ کشوری مطبع کا ہے جو ایسا غلط اور خراب کاغذ پر چھپا ہے کہ اُسکا عدم و وجود برابر ہے۔ مگر نامی صاحب نے اسکی صحت کی پوری جستجو فرمائی اور نواب سر فرخ میرزا صاحب رئیس لہارو کے بھائی مولینا ضمیر میرزا صاحب کی خاص کتب خانہ کی صحیح نسخہ سے غلطیاں درست کیں اسکے بعد ترجمہ کیا۔ دستنبو کا ترجمہ آسان نہ تھا کیونکہ وہ نہایت سخت فارسی میں ہے مگر نامی صاحب نے دو دن کے اندر اتنے مشکل کام کو آسان کر دیا۔ میں پھر انکا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

حسن نظامی

۲۹ محرم سنہ ۱۳۴۱ھ

واقعۂ غدر پر مصنف کی رائے

آج ابتری کا زمانہ ہے۔ ہر ایک نے اپنی چال کو چھوڑا ہے۔ سپاہ نے ہر جگہ سپہ سالار سے منھ موڑا ہے۔ بلکہ زمانہ خود اپنی چوکڑی بھولا ہے۔ ستارہ شناسوں کی رائے ہے کہ جب یزدجرد شاہ ایران پر غازیانِ عرب کے ہاتھوں تباہی آئی تو برجِ سرطان میں زحل اور مریخ کا اتصال تھا اور وہ تباہی اسی اتصال کا نتیجہ تھی۔ آجکل پھر برجِ سرطان میں مریخ اور زحل کا اجتماع ہوا ہے۔ اسی لیے ہر طرف فتنہ و فساد۔ جنگ و جدال برپا ہے مگر اہلِ دانش اس بات کو کب مانیں گے۔ وہاں دو مختلف مملکتوں کی فوجوں کے درمیان جنگ تھی۔ یہاں فوج نے خود اپنے بادشاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے اس لیے ان دونوں حملوں میں کوئی مشابہت اور دونوں حملہ آوروں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ وہاں ایک مذہبی جنگ تھی جس کے بعد اہلِ اسلام نے نئی شان و شوکت کے ساتھ ویران ایران کو شاد و آباد کیا اور نئے مذہب یعنی اسلام نے ملک کو نورِ ایمان سے معمور اور ظلمتِ آتش پرستی کو ملک سے دور کیا۔ لیکن یہاں کہ لڑائی قانونی ہے، حیران ہوں۔ اہلِ ہند نے کس نئے قانون کی امید میں یہ بیر بسایا ہے۔ اہلِ فارس نے آتش کو کھو کر خدا کو پایا لیکن متحیر ہوں کہ اہلِ ہند نے کس امید پہ اربابِ عدل و انصاف کا دامن چھوڑا اور درندہ خصال باغیوں سے رشتہ جوڑا ہے۔ انصاف کی پوچھو تو جو شخص امن و امان، چین و آرام سوائے قلمروِ انگریزی کے کہیں اور تلاش کرتا ہے نابینا ہے۔ ایران میں تیغِ عرب کے زخم خوردوں کو اسلام نے تلافی کا مرہم عطا کیا۔ ہند میں غدر کی مصیبت کے بعد وہ کونسی راحت ہے جس سے

زمانہ نے مصیبت زدگانِ غدر کے مصائب کی تلافی کی ہے۔ اربابِ دانش بتلائیں کہ وہ کونسی بہتری اور بہبودی ہے جو اس ہنگامۂ غدر سے مُلک و ملت کو حاصل ہوگی؟

اہلِ ملک والیانِ مُلک سے لڑ رہے ہیں۔ لشکری سالارِ لشکر کا خون کر رہے ہیں۔ اور پھر خوش ہیں، خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ کہاں ہیں حکمتِ الٰہی کے جاننے والے۔ کہاں ہیں نفع و نقصان، نیک و بد کے پہچاننے والے بتلائیں کہ کیا اس ہنگامہ کا گرم ہونا غضبِ الٰہی کے سوا کسی اور وجہ سے ہو سکتا ہے؟

باغیوں کا دہلی میں داخل ہونا۔ اہلِ شہر کی بے بسی اور انگریزوں کا کشت و خون

۱۶ / ماہِ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۱ مئی سنہ ۱۸۵۷ء کو علی الصباح یکایک دہلی کی شہر پناہ اور قلعہ کی در و دیوار میں زلزلہ پیدا ہوا یعنی میرٹھ چھاؤنی سے کچھ باغی سپاہی بھاگ کر دہلی آ گئے۔ سب کے سب بغاوت پر کمربستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر پناہ کے محافظوں نے جو باغیوں کے ساتھ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے قدرتاً ہمدردی رکھتے تھے اور جو ممکن ہے پہلے سے ان کے ساتھ عہد و پیمان بھی کر چکے ہوں۔ دروازے کھول دیے اور حقِ نمک اور حفاظتِ شہر کو بالائے طاق رکھ کر ان ناخواندہ یا خواندہ مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ان سبک عناں سواروں اور تیز رفتار پیادوں نے جب شہر کے دروازوں کو کھلا ہوا اور دربانوں کو مہمان نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے اور جہاں جہاں انگریز افسروں کو پایا قتل کر ڈالا اور ان کی کوٹھیوں میں آگ لگا دی

اہلِ شہر جو سرکار انگریزی کے نمک خوار تھے اور حکومتِ انگریزی کے سایہ میں امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ہتھیار سے بیگانہ۔ تیر و تبر میں بھی امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ نہ ہاتھ میں تیر رکھتے تھے نہ شمشیر۔ سچ پوچھو تو یہ لوگ صرف اس مطلب کے تھے کہ گلی کوچوں کو آباد کردیں۔ اِس گُن کے ہرگز نہ تھے کہ جنگ و جدل کے واسطے کمر بستہ ہوں۔ اس کے علاوہ تیز رو سیلاب کو گھانس پھونس کب روک سکتا ہے۔ اِن غریبوں نے اپنے آپ کو اِس آفت ناگہانی کے آگے عاجز اور بے بس پایا اس لیے گھروں کے اندر غم اور ماتم میں بیٹھ رہے۔ بندہ بھی انہی ماتم زدگان میں سے ہے۔ گھر میں بیٹھا تھا کہ شور و غوغا بلند ہوا۔ قبل اس کے کہ سبب دریافت ہو چشم زدن میں صاحب ایجنٹ بہادر کے قلعہ میں مارے جانے کی خبر آئی۔ ساتھ ہی معلوم ہوا کہ سوار اور پیادے ہر گلی کوچہ میں گشت لگا رہے ہیں۔ پھر تو کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو گل اندا موں کے خون سے رنگین نہ ہو اور باغ میں کوئی جائے گلگشت ایسی نہ تھی جو ویرانی میں مانند گورستان نہ ہو۔ کیسے کیسے انگریز افسر، منصف مزاج، دانشور، نیک خو، نام آور تلوار کے گھاٹ اُترے۔ کیسی کیسی پری چہرہ، نازک اندام خاتونانِ فرنگ خاک و خون میں نہائیں۔ افسوس ان کے ننھے ننھے بچے جن کی شگفتہ روئی لالہ و گل پہ ہنستی تھی اور جن کی خوش خرامی کبک و چکور کو شرماتی تھی کس طرح تیغ بیدریغ کے نذر ہوئے۔ اگر ہوسکتا ان مقتولوں کے سرہانے ماتم میں سیاہ پوش ہو کر گریہ و زاری کرے تو روا ہے۔ اگر آسمان خاک ہو کر برسے اور زمین غبار ہو کر اُڑے تو بجا ہے

اے نوبہار چوں تنِ بسمل بخوں بغلط اے روزگار چوں شبِ بے ماہ تار شو

اے آفتاب روئے بسیلی کبود کن　　اے ماہتاب داغ دل روزگار شو

باغیوں کا طرزِ عمل اور اس پر مصنف کی رائے

خدا خدا کرکے وہ دن گزرا اور شام ہوئی، سیاہ دل باغیوں نے صرف جا بجا شہر میں قیام کیا بلکہ قلعہ میں شاہی باغ کو اصطبل اور شاہی محلسرا کو اپنی خوابگاہ بنایا۔ رفتہ رفتہ دوسرے مقامات سے خبر آئی کہ باغی سپاہیوں نے فوجی افسروں اور انگریز عہدہ داران کو قتل کر دیا۔ اور جوق جوق سپاہی اور کاشتکار متفق اور متحد ہو رہے ہیں اور سب کے سب بغاوت پر کمربستہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب جھاڑو کی طرح ایک ہی بندھن میں بندھے ہوئے ہیں کیوں نہ ہو، ہندوستان پر اس طرح جھاڑو پھیرنے کے لیے کہ اگر آرام و آسائش گھاس کے تنکے کے برابر بھی ڈھونڈھیں تو کہیں میسر نہ آئے ایک ایسی ہی جھاڑو کی ضرورت ہے۔ ہزار ہا لشکر جمع ہو رہا ہے۔ مگر ہر لشکر ایک بے سری فوج ہے۔ تماشہ یہ ہے کہ توپ بندوق۔ گولہ باروت سب انگریزوں ہی سے حاصل کیا اور پھر انگریزوں ہی سے لڑائی ہے۔ قواعدِ جنگ، فنونِ سپہگری سب انگریزوں ہی سے سیکھے اور انگریزوں ہی کے مقابلہ میں انکے استعمال کی تیاری ہے۔ آخر دل ہی ہے سنگ و خشت تو نہیں کہ نہ جلے۔ آنکھ ہے روزنِ دیوار نہیں کہ نہ روئے دل کیوں نہ جلے کہ بیگناہ انگریزوں کے قتل کا داغ لیے ہوئے ہے۔ آنکھ کیوں نہ روئے کہ ہندوستان کی تباہی دیکھ رہی ہے۔ شہر والیانِ شہر سے خالی ہو کر بے آقا کے غلاموں سے معمور ہیں چور اور ڈاکوؤں کو نہ گرفتاری کا ڈر ہے نہ قید کا خطر۔ محلّے ویران اور بازار لوٹ کا میدان ہیں۔ ڈاک بند ہے جس سے نہ صرف نامہ و پیام بلکہ تمام کام و رہم برہم ہیں۔ حامیانِ دین و آئین فرمائیں کہ کیا یہ رونے کا مقام نہیں

کہ ڈاک جیسی نعمت خداداد درہم برہم ہو جائے جس کے یہ معنی ہیں کہ مصیبت نازل ہو اور عزیزوں کو عزیزوں کی مصیبت کی خبر تک نہ ہو۔ نیرنگیٔ زمانہ دیکھیے کہ جو کشورکشائی اور جانبازی کا دم بھرتے تھے آج اپنے سایہ سے ڈرتے ہیں اور نقیب و چوبدار شاہ و گدا اسپ پر حکومت کرتے ہیں۔ پھر ستم یہ کہ مصیبت پر گریہ و ماتم کرو تو نشانۂ ملامت و ظرافت بنو۔ اگر اس آفت سے بیزار اور اس ماتم میں سینہ فگار ہو تو ضعیف ایمان کے طعنے سنو۔

دہلی میں باغیوں کا اجتماع اور لڑائی کا آغاز

الغرض سرکش باغیوں نے شہر میں داخل ہوتے ہی جو کچھ زر و مال اپنے ساتھ لائے تھے سب شاہی خزانہ میں داخل کر دیا اور آستانِ شاہی پر جبینِ اطاعت کو رکھا چشم زدن میں بے انتہا فوج دہلی میں جمع ہو گئی۔ چونکہ ضعیف بادشاہ اس بے شمار لشکر کو نہ روک سکا، اور قابو میں نہ رکھ سکا، بے قابو ہو گیا اور لشکر کے قابو میں آ گیا۔ باغیوں کا قاعدہ تھا کہ جہاں جہاں سے گزرتے قید خانوں سے قیدیوں کو چھوڑتے جاتے تھے۔ چنانچہ پرانے پرانے قیدی قید سے رہا ہو کر دربار میں حاضر ہوئے اور خدمتگاری اور سرداری کے باصرار خواستگار ہوئے۔ کمال یہ ہے کہ ہر شخص کو دربار شاہی میں باریابی حاصل ہو جاتی تھی۔ غرض شہر کے اندر اور باہر کم و بیش پچاس ہزار پیادے اور سوار جمع ہو گئے۔ انگریزوں کے پاس علاقۂ دہلی میں سے سوائے اس پہاڑی کے جو شہر کے پہلو میں واقع ہے اور کچھ باقی نہ رہا۔ چنانچہ ان اہلِ دانش نے اسی جائے تنگ میں دمدمے اور مورچے بنائے اور ان پر زبردست توپیں لگائیں۔ دلیسیوں نے بھی جو توپیں میگزین سے اڑائی تھیں ان کو لیجا کر قلعہ پر نصب کیا اور دونو

جانب سے گولہ باری شروع ہوئی۔ مئی اور جون کی گرمی تھی اور آفتاب کی حرارت دن بدن زیادتی پر تھی۔ باغی ہر روز صبح کو انگریزی فوج کے مقابلہ کے واسطے نکلتے اور سورج غروب ہونے سے پہلے واپس آجاتے تھے۔

حکیم احسن اللہ خاں صاحب پر حملہ اندرونِ شہر کی کیفیت بھی سننے کے قابل ہے۔ ایک شخص جو حکیم احسن اللہ خاں صاحب کا پروردہ اور آوردہ تھا اور جو خیانت سے بہت کچھ روپیہ جمع کر چکا تھا اس خیال سے کہ جب تک حکیم صاحب جنکو اس کی خُرد بُرد کا علم تھا؛ زندہ ہیں راز فاش ہونے کا اندیشہ رہیگا ان کے قتل کے درپے ہوا، اور یہ افواہ اُڑائی کہ حکیم صاحب انگریزوں کے خیرخواہ اور طرفدار ہیں۔ اس طرح باغیوں کو ان کے خلاف برانگیختہ کیا، چنانچہ ایک روز بدبخت باغی حکیم صاحب کو قتل کرنے کے لیے ان کے دولت کدہ پر حملہ آور ہوئے۔ مگر خوش قسمتی سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں بادشاہ کی خدمت میں تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ ان ناہنجاروں میں سے کچھ لوگ قلعہ پہنچے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ سلامت نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈالدیا اور ان کی جان بچائی۔ اگرچہ حکیم صاحب کی جان بچ گئی مگر بدبخت باغیوں کو اس وقت تک چین نہ آیا جب تک انہوں نے حکیم صاحب کا مکان لوٹ کر اس میں آگ نہ لگادی افسوس کوئی غلام جب تک اس کی اصل میں فرق نہ ہو اپنے آقا کے ساتھ ایسا نہ کرے گا۔

بہادر شاہ کے معاون جب شاہی جھنڈے کے نیچے بکثرت پیادہ و سوار جمع ہو گئے تو تفضل حسین خاں والیٔ فرخ آباد نے جو پہلے کبھی بادشاہ کی طرف

رخ بھی نہ کرتا تھا ایک خط کے ذریعہ اپنی اطاعت کا اظہار کیا۔ ادھر خان بہادر خاں نے بریلی میں ایک عظیم الشان لشکر جمع کر کے علمِ بغاوت بلند کیا اور ایک سو ایک اشرفیاں اور آراستہ ہاتھی گھوڑے بادشاہ کی خدمت میں بطور پیشکش روانہ کیے۔ لیکن نواب یوسف علی خاں بہادر فرمانروائے رامپور جن کی دوستی سرکار انگریزی کے ساتھ بیحد استوار تھی بادشاہ کی خدمت میں ایک خشک پیام ہی بھیجنے پر اکتفا کی اور یہ بھی صرف ہمسایوں کے طعنوں سے بچنے کے واسطے کیا۔ لکھنؤ میں بغاوت شروع ہوتے ہی صاحبانِ انگریز شہر سے نکل گئے اور دیگر مستحکم مقامات میں اپنے بھائیوں اور فدائیوں سے جا ملے۔ لیکن بعض افسرانِ انگریز اپنے ہمراہیوں سمیت لکھنؤ ہی میں مقام بیلی گارد میں قلعہ بند ہو گئے۔ شرف الدولہ نے جو شاہانِ اودھ کا وزیر مشہور تھا واجد علی شاہ کی اولاد میں سے ایک دہ سالہ لڑکے کو تخت پر بٹھایا اور خود وزیر بنا اور ایک پیشکش گرانبہا شاہِ دہلی کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب یہ نذرانہ بادشاہ کی خدمت میں پہنچا تو بادشاہ کو اپنی کامیابی کی کافی امید ہو گئی اور خیال کیا کہ پھر ستارۂ اقبال چمکا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کا ستارۂ اقبال ہمیشہ کیلیے غروب ہو گیا۔

شہر دہلی کے اندر لڑائی اور قتل و غارتگری اور اسپر مصنّف کی رائے

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزی سپاہ نے اس شدّ و مد کے ساتھ کشمیری دروازہ پر گولہ باری کی کہ کالوں کی سپاہ میں بھاگڑ پڑ گئی۔ اگرچہ گیارہ مئی سے چودھویں ستمبر تک چار ماہ اور چار روز کا وقفہ تھا۔ لیکن چونکہ شہر دوشنبہ ہی کے روز ہاتھ

سے نکلا اور دو شنبہ ہی کو پھر قبضہ میں آگیا۔ اِس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی
دن کے اندر شہر ہاتھ سے نکلا اور ہاتھ میں آگیا۔
غرض فتحمند فوج اس سڑک سے جو ان کے سامنے تھی شہر میں داخل ہوئی
جو شخص راہ میں ملا قتل کر دیا گیا۔ معززین شہر اپنی آبرو کو بچائے ہوئے گھروں
میں پڑے رہے۔ باغی شہر سے بھاگ نکلے کچھ ایسے تھے جنہوں نے مقابلہ
کیا اور سینہ سپر ہو کر لڑے۔ اپنے نزدیک دوسروں کو کاٹا۔ مگر میرے نزدیک
اہلِ دہلی کی جڑیں کاٹ گئے۔ دو تین روز تک شہر میں کشمیری دروازہ سے
لیکر چاروں طرف کوچہ و بازار میدانِ کارزار بنے رہے۔ رفتہ رفتہ صرف تین
دروازے یعنی اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ کالوں کے
قبضہ میں رہ گئے۔ گوروں نے شہر میں داخل ہوتے ہی بیگناہوں اور بیواؤں
کو قتل کرنا شروع کیا اور جا بجا مکانات میں آگ لگا دی حقیقت یہ ہے کہ
جب کوئی مقام سخت خونریزی کے بعد حملہ آور کے قبضہ میں آتا ہے تو اس
مقام کے رہنے والوں پر اسی قسم کی سختیاں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔
جب اہلِ شہر نے فتحمندوں کی یہ کینہ وری اور غیظ و غضب دیکھا تو انکی
امید ناامیدی سے بدل گئی اور بے شمار غربا و شرفا اپنی مستورات کو لیکر
ان تینوں دروازوں میں سے شہر چھوڑ کر نکل گئے اور شہر کے باہر چھوٹی چھوٹی
بستیوں اور قبرستانوں میں جا کر دم لیا۔ جب وہاں بھی چین نہ ملا تو ان میں سے
بہت سے سفر کے مصائب اُٹھاتے دور دراز مقامات میں چلے گئے۔
۱۴ ستمبر کے بعد پانچ روز تک شہر کے اندر کالے اور گوروں میں جا بجا

لڑائی ہوتی رہی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کالے پیچھے ہٹتے گئے اور گورے شہر پر قابض ہوتے گئے۔ بالآخر ۲۰ ستمبر کو جمعہ کے روز شہر کالوں سے خالی ہو گیا اور دہلی اور قلعۂ دہلی پر انگریزوں کا پورا پورا تسلط ہو گیا۔ اسکے بعد پکڑ دھکڑ قتل و غارتگری کا بازار اور زیادہ گرم ہوا۔

گوروں کا تشدّد اور اسپر مصنّف کی رائے

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ اس شہر گردی میں مختلف علاقوں میں طریقۂ سخت گیری مختلف رہا اور تشدد و تظلّم سب پر یکساں نہ تھا۔ ہر شخص کے رویہ اور حیثیت کے مطابق اس پر ظلم ہوا۔ اپنے علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی سپاہیوں کو حکم یہ تھا کہ جو شخص اطاعت قبول کر لے اُس کے قتل سے ہاتھ اُٹھائیں اور صرف اسکو لوٹ لینے ہی پر اکتفا کریں۔ مگر جو شخص مقابلہ کرے اُس کو قتل کر دیں۔ اور اس کا گھر بار لوٹ لیں۔ اب جو لوگ مارے گئے اُن پر یہی گمان کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سرتابی کی ہوگی۔ مشہور بھی یہی ہے کہ انگریزی سپاہ نے زیادہ تر لوگوں کا مال و متاع لوٹ لیا مگر ان کی جانوں کو کوئی گزند نہ پہنچایا لیکن کہیں کہیں ایک دو محلوں میں ایسا بھی ہوا کہ لوگوں کو قتل بھی کیا گیا اور ان کا مال و اسباب بھی لوٹ لیا گیا۔ لیکن بوڑھوں، بچّوں اور عورتوں کے قتل سے ہمیشہ پرہیز کیا گیا، اس کے مقابلہ میں اہلِ انصاف ہندوستانیوں کا یہ تادہ یاد کریں بتلائیں کہ ایسی صورت میں جبکہ دشمنی اور کینہ دری کی کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو اور آقا کشی گناہ خیال کی جاتی ہو اپنے آقا پر تلوار کھینچنا اور بے گناہ عورتوں اور شیر خوار بچّوں کو قتل کرنا کہاں تک قرینِ انصاف ہے۔ برخلاف

اِس کے انگریزوں کے طرزِ عمل پر غور کیجیے کہ دشمنوں سے انتقام لینے اور مجرموں کو سزا دینے کی غرض سے کھڑے ہوئے ہیں۔ اہلِ شہر سے بیحد بد دل اور ناراض ہیں۔ اس پر بھی غلبہ پانے کے بعد جبکہ دلّی کے گتّے بلّی کو بھی زندہ نہ چھوڑنا چاہیے تھا وہ غصّہ کو ضبط کرتے ہیں، عورتوں اور بچّوں کو ہاتھ نہیں لگاتے، بے قصور اور قصوروار میں پورا پورا فرق کرتے ہیں، اور کسی شخص کو سوائے اُن لوگوں کے جن کو بازپُرس کے واسطے بُلاتے ہیں حیران نہیں کرتے۔ اہلِ شہر میں سے بہت سے شہر بدر کر دیے گئے۔ جو باقی ہیں، امید و بیم کی حالت میں ہیں۔

۱۷ اکتوبر چہارشنبہ کے روز شہر میں اکیس [۲۱] توپوں کی سلامی ہوئی حیرانی ہوئی کہ لفٹنٹ گورنر بہادر کی آمد پر ۱۷ توپوں کی سلامی ہوتی ہے، اور نواب گورنر جنرل بہادر کی آمد پر ۱۹ توپوں کی سلامی اُترتی ہے۔ ۲۱ توپوں کی سلامی چہ معنی دارد۔ کسی سے کچھ نہ معلوم ہو سکا گمانِ غالب یہ ہے کہ غالباً سپاہِ انگریزی کو کسی مقام پر باغیوں پر کوئی زبردست فتح حاصل ہوئی ہے۔

باغیوں کے زیرِ اثر مقامات اگرچہ دہلی میں فتنہ فرو ہو گیا۔ مگر ابھی بدکردار باغیوں نے ایک طرف بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں شورش برپا کی ہے، اور دوسری طرف سونپت اور میوات کے علاقہ میں فتنہ کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ تلارام نامی ایک شخص نے کچھ دنوں ریواڑی میں شورش برپا کی پھر دیوا میو کے ساتھ ملکر میوات کے پہاڑ اور جنگلات میں انگریزوں کے مقابلہ کے لیے آمادہ ہوا۔

نواحِ دہلی کے رئیسوں کا قلعہ میں اجتماع جس ہفتہ میں انگریزی سپاہ

نے شہر پر قبضہ کیا اسی ہفتہ میں امین الدین احمد خاں بہادر و ضیاء الدین احمد خاں
بہادر اپنے اہل و عیال کے ساتھ تین ہاتھی اور چالیس تیز رفتار گھوڑوں پر
سوار ہو کر اپنی جاگیر لوہارو کی طرف روانہ ہوئے۔ مہرولی پہنچکر ایک دو روز
قیام کیا۔ دوران قیام میں لشکریان غارتگران پہ آن پڑے اور جو کچھ پاس
تھا لوٹ کر لے گئے۔ چنانچہ بے سر و سامانی کی حالت میں یہ رؤسائے
ذیشان دوجانہ کی طرف روانہ ہوئے۔ احسن علی خاں بہادر والیِ دوجانہ
نے نہایت مہربانی اور فیاضی سے حقِ مہماں نوازی ادا کیا۔ جب صاحب کمشنر
بہادر کو خبر ہوئی تو بلایا۔ چنانچہ وہ رؤسائے آسماں شان پھر جانب دہلی
روانہ ہوئے۔ صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچے اور آداب بجالائے
صاحب بہادر نے طنز آمیز گفتگو شروع کی۔ لیکن جب نرم اور مؤدبانہ
مصالحانہ جواب سنا تو خاموش ہو رہے اور قلعہ میں قیام کرنے کی اجازت
دی۔ دو تین روز بعد حکم ہوا کہ عبدالرحمٰن خاں والیِ جھجر کو گرفتار کر لائیں جب
وہ رئیس والاشان وارد دہلی ہوا تو اس کو قلعہ میں دیوانِ عام میں ایک طرف
قیام کرنے کا حکم ہوا اور اس کی تمام ریاست انگریزی علاقہ میں شامل
کر لی گئی۔ اسی طرح ۳۰ اکتوبر جمعہ کے روز احمد علی خاں والیِ فرخ نگر کو
گرفتار کر کے دہلی لائے اور قلعہ میں ایک علیحدہ جگہ اُتارا۔ ۱۳ نومبر شنبہ
کے روز بہادر جنگ خاں والیِ بہادر گڑھ کو دہلی لایا گیا اور اس کے واسطے
بھی قلعہ ہی میں جائے قیام مقرر ہوئی۔ اسی طرح بروز شنبہ راجہ ناہر سنگھ
والیِ بلب گڑھ بھی قلعہ میں لائے گئے۔ نواحِ دہلی میں سات ریاستیں دہلی کی

اجنسی سے متعلق ہیں۔ جھجر۔ بہادر گڑھ۔ بلب گڑھ۔ لوہارو۔ فرخ نگر۔ دوجانہ اور پاٹودی۔ ان سات ریاستوں میں سے پانچ ریاستوں کے رئیس اس وقت قلعہ میں جدا جدا مقام پر مقیم تھے۔ پاٹودی، اور دوجانہ کے رئیس، اپنی اپنی ریاستوں میں خوف زدہ سکتہ کے عالم میں منتظر تھے کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

انہی ایام میں مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اور ذو الفقار الدین حیدر خاں بھی اپنے متعلقین کے ساتھ شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنے بھرے بھٹولے گھر لوٹ کے حوالہ کر گئے۔ شہزادگان خاندان تیموری میں سے کچھ لڑائی میں مارے گئے۔ کچھ گرفتار ہو کر قید خانوں میں پڑے ہوئے اپنے دن پورے کرتے ہیں۔ معدودے چند ایسے تھے جو جان بچا کر بھاگ گئے۔ ضعیف العمر بادشاہ کی گرفتاری کا حکم صادر ہے کہ باز پرس کی جائے۔ والیان جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کو علیٰحدہ مختلف اوقات میں پھانسی دیدی گئی۔

حکیم محمود خاں صاحب اور سائٹھ اور آدمیوں کو حوالات

۱۸۵۸ء کے آغاز میں جنوری کے مہینہ میں ہندوستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ پھر شہر میں واپس آنے لگے۔ اسی اثناء میں حاکم شہر کو خفیہ رو نے خبر دی کہ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے معالج یعنی حکیم محمود خاں صاحب کا مکان مسلمانوں کے لیے جائے پناہ بنا ہوا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو باغی بھی ان لوگوں میں ہوں جو حکیم صاحب کے ہاں پناہ گزیں تھے چنانچہ ۲۔ فروری سہ شنبہ کے روز حاکم مذکور دوڑ لیکر آ گیا اور مالک خانہ کو

بع ساٹھ اور آدمیوں کے پکڑ کر لے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات رہی لیکن حکیم صاحب کی عزت و آبرو کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا۔ بالآخر حکیم محمود خاں حکیم مرتضٰے خاں اور ان کے چچا زاد بھائی حکیم عبدالحکیم خاں کو واپسی کی اجازت ہو گئی۔ ۱۲ر فروری کو کچھ لوگ اور چھوڑ دیے گئے۔ ۱۳ر فروری کو تین آدمیوں نے اور رہائی پائی۔ مگر نصف سے زائد آدمی حوالات ہی میں رہے۔

لکھنؤ میں لڑائی اور شہر پر قبضہ اسی ماہ میں سر جان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر کی آمد آمد کی خبر شہر میں گرم ہوئی۔ اور ۲۰ ر فروری شنبہ کے روز شام کے وقت ۲۱ توپوں کی سلامی سے شہر گونج اٹھا۔ دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ شہر لکھنؤ فتح ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی سُنا کہ لکھنؤ میں ۱۶ ر فروری کو کمانڈر انچیف بہادر نے نہایت بہادری کے ساتھ باغیوں پر ایک ایسا سخت حملہ کیا کہ ان کے دھوئیں اُڑا دیے۔ دوسرے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہ توپیں لکھنؤ کی فتح کی سلامی نہ تھی بلکہ سپاہِ انگریزی کو باغیوں پر جو نمایاں غلبہ حاصل ہوا ہے اس کی خوشی میں چھوڑی گئیں تھیں۔ چوبیس ۲۴ فروری چہار شنبہ کے روز صبح کے وقت صاحب چیف کمشنر بہادر کا دہلی میں ورود ہوا۔ ۱۳ توپوں کی سلامی ہوئی اور اہلِ شہر کے تنِ مردہ میں پھر جان آئی ؎

در کالبدِ شہر رواں باز آمد فرماں فرمائے خسرواں باز آمد
زیں شاہی و خوشدلی کہ رو داد بہ شہر گوئی کہ مگر شاہجہاں باز آمد

۲۷ ر فروری شنبہ کے روز اس رحم دل حاکم نے فریادیوں کی دادرسی کی اور

امن وامان کا مژدہ سنایا۔

اہلِ دہلی کی مصائب آجکل قید خانہ شہر کے باہر اور حوالات شہر کے اندر ہے۔ ان میں قیدیوں کا وہ ہجوم ہے کہ الامان والحفیظ۔ ان کے علاوہ جو لوگ پھانسی چڑھ گئے ان کی تعداد خدا ہی خوب جانتا ہے۔ آجکل دہلی میں مسلمان ہزار آدمیوں سے زیادہ نہ ہوں گے۔ گروہا گروہ کلمہ گو شہر سے نکل کر دو دو تین تین کوس پرے کھنڈرات میں، ویرانوں میں۔ پہاڑ کے کھنڈروں میں زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ جو لوگ شہر میں باقی رہ گئے ہیں، ان میں یا تو قیدیوں کے عزیز واقربا ہیں اور یا پنشن خواران سرکار ہیں۔

باغیوں کا ہر جگہ قلع وقمع اٹھارہ مارچ بروز پنجشنبہ شام کے وقت گردوں شگاف توپوں کی آواز نے خبر دی کہ لکھنؤ میں کامل طور پر انگریزی تسلط ہو گیا۔ اپریل کے مہینہ میں حکیم محمود خاں صاحب کے ساتھیوں نے جو اس وقت تک حوالات میں تھے رہائی پائی اور حکیم صاحب اپنے عزیز واقربا کے ساتھ پٹیالہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مئی کے شروع میں خبر آئی کہ انگریزی سپاہ نے مرادآباد باغیوں سے خالی کرالیا۔ اور فتح کے بعد مرادآباد نواب یوسف علی خاں صاحب والیِ رامپور کی قلمرو میں شامل کیا گیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے بریلی کو فتنہ پرداز باغیوں سے خالی کیا چنانچہ اب قوی امید ہے کہ عنقریب انگریزی سپاہ ہر جگہ باغیوں کا قلع وقمع کردیگی اور پھر تمام ہندوستان ازسرِنو سرکارِ انگریزی

کے سایۂ عدل و انصاف میں آجائیگا۔

۱۳/ جون یکشنبہ کے روز شام کے وقت بہادر جنگ خاں والی بہادر گڑھ کو بُلا کر حکم جاں بخشی سُنایا گیا۔ اور ساتھ ہی ایک ہزار روپئے ماہوار وظیفہ کا مژدہ دیا گیا۔

۲۲/ جون کو ۲۱ توپوں کی سلامی نے خبر دی کہ انگریزی سپاہ کی جانبازانہ کوششوں سے گوالیار اور قلعۂ گوالیار فتح ہو گیا جس کی مختصر روداد یہ ہے کہ باغیانِ سرکش دیگر مقامات کی طرح گوالیار پر بھی قابض ہو گئے تھے۔ راجہ گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ شہر اور شہریاری چھوڑ کر آگرہ بھاگ گیا۔ اور انگریزوں سے مدد مانگی۔ انگریزوں نے ایک جرّار فوج سے اس کی مدد کی۔ چنانچہ راجہ نے انگریزی فوج کی مدد سے باغیوں کو شکست فاش دی۔

باغیوں کا حشر

باغیوں کا جو کچھ حشر ہوا وہ ان کے کردار کی کافی سزا تھی۔ یہ گمراہ سرکش ہر طرف سے ہزیمت پا کر گوالیار پہنچے لیکن جب وہاں بھی شکست فاش کھائی تو مدّت تک رواں دواں پھرتے رہے۔ اور رہزنی اور ڈاکہ زنی کرتے پھرے۔ آخر کار ہر جگہ نہایت ذلّت و خواری کے ساتھ ایک ایک کر کے مارے گئے۔
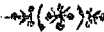
مضمون "دستنبو" پر رائے

رسالہ دستنبو کا ترجمہ ختم ہوا۔ میرزا نامی نے جس خوبی سے دستنبو کا ترجمہ کیا اُسکی تعریف مشکل ہے
جو لوگ ترجمہ کی دشواریوں سے واقف ہیں وہ دستنبو کا اصل متن سامنے رکھینگے تو اُن کو بے اختیار اس
ترجمہ کی داد دینی پڑیگی کہ غالب کی سخت اور مشکل فارسی عبارت کا جس کو عربی الفاظ سے دانستہ
محفوظ رکھنے کی کوشش کیگئی تھی، ایسا عام فہم اور صحیح ترجمہ کیا گیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ دوسری
خوبی یہ ہے کہ ترجمہ کے الفاظ غالب کی اُردو طرز تحریر سے مشابہ کر دیئے گئے ہیں اور بادی النظر
میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالب ہی کی لکھی ہوئی عبارت ہے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ ترجمہ کا
انداز بالکل روزنامچہ کا سا بنا دیا گیا ہے تاکہ کتاب روزنامچہ کی عبارت سے بے میل معلوم نہ ہو،
یہ تمام کمالات معمولی نہیں ہیں اور میرزا نامی کی غیر معمولی قابلیت کو ظاہر کرتے ہیں +

آجکل کے زمانہ میں غالب کی یہ تحریر شاید لوگوں کو پسند نہ آئیگی کیونکہ اُنہوں نے ہندوستانی باغیوں کی
خطاؤں کو بہت نمایاں کر کے دکھایا ہے اور انگریزی لشکر کی زیادتیوں پر احتیاط و مصلحت کا پردہ ڈالنے کی
کوشش کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غالب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ باغیوں نے انگریزوں کی عورتوں اور بچوں کیساتھ
جسقدر زیادتیاں کیں وہ اُنکے مذہب اور ملک کے روایات کے سراسر خلاف حرکات تھیں انگریزی فوج نے ہندوستانی
عورتوں اور بچوں سے کوئی ایسا نمایاں ظلم نہیں کیا جو قابل ذکر ہو، البتہ غالب نے یہ لکھنے کی حالات کی نزاکت کے
سبب جرأت نہیں کی کہ انگریزی لشکر نے باغیوں کے علاوہ شہری باشندوں سے جیسی سفاکی کیساتھ انتقام لیا اور
جس بے دردی سے بیشمار آدمیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا وہ تاریخ کا نہایت افسوسناک واقعہ ہے اور خود انگریز مدبروں اور
مورخوں کو اسکا اقرار ہے کہ دہلی فتح کرنے کے بعد انگریزی لشکر نے بیگناہوں کا قتل عام کر کے برٹش انصاف اور تحمل
کو داغدار بنا دیا +

بہرحال میرا مقصد تو غالب مرحوم کے ایک ادبی اور لٹریری کارنامہ کو اُردو زبان کے ذخیرہ میں
بڑھانا تھا غدر کے اسباب کی بحث سے مجھے کچھ سروکار نہیں اسکا فیصلہ مورخ کرینگے کہ حق پر کون تھا
اور ناحق پر کون +

حسن نظامی

باپ کو غصّہ آ گیا

جب اُس نے دیکھا کہ اُسکی لڑکیاں اور لڑکے تمام دن ایک کتاب کے پڑھنے میں مصروف رہے اور شام ہو گئی جب بھی اندھیرے میں اُسکو پڑھے جاتے ہیں، باپ نے قریب جا کر دیکھا تو کتاب کا نام اولاد کی شادی تھا، وہ یہ نام دیکھتے ہی غصّہ سے بیتاب ہو گیا اور اُسنے کہا "بچوں کو شادی بیاہ کے قصّے پڑھنا بڑی بے غیرتی کی بات ہے" مگر بچوں کی ماں نے جواب دیا۔ صاحب! میں نے یہ کتاب انکو پڑھنے کیلیئے دی ہے کیونکہ میرے خیال میں وہ شریعت کا حکمنامہ ہے اور دُنیا کے تجربات کا خزانہ ہے اور میرے خیال میں ہر لڑکے اور لڑکی کو شروع سے یہ کتاب پڑھا دی جائے تاکہ شادی بیاہ کی خرابیاں ہماری قوم سے دور رہیں۔

باپ نے کہا، اچھا اگر ایسی چیز ہے تو میں بھی پڑھنے کی اجازت دیتا ہوں، مگر تعجب ایسا ہے کہ بچوں کا دل اس کتاب میں کیونکر لگ گیا؟ بیوی نے کہا۔ کتاب اولاد کی شادی بہت ہی دلچسپ ہے اور ہر بیان بڑا ہی مزیدار لکھا گیا ہے۔ خصوصاً صفدری کا قصّہ تو ایسا دردناک اور عبرت خیز ہے کہ پڑھنے سے دل ہل جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف خواجہ حسن نظامی دہلوی ہیں جنکی کتاب بیوی کی تعلیم اور "بیوی کی تربیت" کا یہ تیسرا حصّہ ہے۔

قیمت عہ، مجلد ہر علاوہ محصول۔

منیجر خواجہ ڈپو۔ دہلی